شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

کا قافلہ

اللہ اکبر

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

فک کل نظام

تالیف

ظہور الدین بٹ





شاہ ولی اللہؒ کا قافلہ

شاہ ولی اللہؒ تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے برصغیر پاک و ہند میں ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی اس فکر کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے آپ کے خلف الرشید اور خلیفہ ارشد شاہ عبدالعزیزؒ اُن کے مرید سیّد احمد شہیدؒ مولانا عبدالحیؒ مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ و دیگر اکابرین نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۶۳ـ۱۷۰۳) اور اُن کے قافلے کے جلیل القدر سپہ سالاروں نے ۱۹۲۰ء تک دارالحرب ہند کو دارالسلام میں تبدیل کرنے کی عظیم جدوجہد کی۔

سیّد احمد شہیدؒ اور اُن کے ساتھی سرحد کے آزاد علاقے میں ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو مسلم انقلابیوں کی عارضی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس اسلامی ریاست کی زندگی انتہائی مختصر رہی۔ اس قافلے کے آخری سالار مولانا محمود حسن نے انگریزوں کے خلاف ریشمی رومال کی تاریخی جدوجہد شروع کی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند کی وفات کے ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف یہ عسکری جدوجہد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اس کتاب میں برصغیر پاک و ہند میں اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کے سلسلے میں کی جانے والی دو سو سال کی طویل جدوجہد کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نوجوان نسل اس کتاب سے استفادہ کر کے پاکستان کو مضبوط و مستحکم اسلامی ریاست بنانے کے لیے اپنی توانائیوں کا صحیح استعمال کرنے کا عزم کر لے تو یہ حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے عظیم ساتھیوں کی خدمت میں بہترین خراج تحسین ہو گا جو وہ اپنی عملی زندگی سے پیش کر سکتے ہیں۔

ظہور الدین بٹ

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کا قافلہ



تالیف

ظہور الدین بٹ

ادارہ ادب اطفال لاہور
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

نام کتاب : شاہ ولی اللہؒ کا قافلہ
کمپوزنگ : علی گرافکس
سرورق : عبیداللہ
پرنٹر : اے این اے پرنٹرز
قیمت : -/۱۲۰ روپے

انتساب

اُستادِ محترم جناب سید نفیس الحسینی کے نام جن کے ذریعے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے قافلہ کے عظیم سالاروں سے متعارف ہوا

ترتیب

❋❋❋

پہلی بات

اورنگزیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی برِعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی حکومت کا سنہرا دور ختم ہو گیا۔ مختلف ریاستوں اور صوبوں کی خود مختاری کے اعلان سے ہندوستان کا مضبوط اور مستحکم مرکز بھی انتشار کا شکار ہو گیا۔

اسی دور میں برطانوی استعمار نے دنیا کے مختلف علاقوں کے ساتھ ساتھ برِعظیم پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے تھے۔ مغلوں کے دور میں تجارت کے بہانے سہولتیں حاصل کرنے والے انگریزوں نے مسلمانوں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کو اپنی کالونی بنانے کی جدوجہد تیز کر دی۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے اقتدار کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر ان کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ ۱۷۳۰ء (۱۱۴۳ ہجری) میں وہ حج کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئے۔ یہاں دو سالہ قیام کے دوران میں انہوں نے یورپ، افریقہ اور ایشیائی ممالک کے حجاج کرام سے ملاقاتیں کیں۔

چشمِ فلک نے تختِ دہلی کے حصول کے لیے صرف ۵۰ سال کی مختصر مدت میں لال قلعہ میں گردن زنی اور رسمِ تاجپوشی کے دس پر ہیجان اور وحشت انگیز تماشے دیکھے۔

ان حالات میں آپ نے یہ تجزیہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے شاہ پرستی ماضی میں سود مند رہی ہو تو رہی ہو لیکن اب بادشاہی نظام اپنی افادیت کھو بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے بادشاہی کے فرسودہ نظام کو ختم کرنے اور اسلام کے سیاسی و انقلابی پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

آپ نے پہلی مرتبہ مزدور اور محنت کش کو اس کے حقیقی مقام اور مرتبے سے آگاہ کیا۔ آپ نے ملک سے جوا، سٹہ اور عیاشی کے تمام اڈوں کو بند کرانے کی کوشش کی۔ ان

کے نزدیک سٹہ، جوا اور عیاشی کے اڈے ختم کیے بغیر معاشرے کی اصلاح ممکن نہ تھی۔

مرہٹے جو اورنگزیب کے دور میں شکست کھا کر دبک گئے تھے انہوں نے اب پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۷۳۶ء میں وہ فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوئے۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے چند گھنٹوں میں ڈیڑھ لاکھ افراد کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ لڑی اور ۱۷۵۲ء میں سورج مل جاٹ نے دہلی کو لوٹا۔ ۱۷۶۳ء (۱۱۷۶ ہجری) میں شاہ ولی اللہ وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے باپ کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھا۔

۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کو پھانسی دی گئی۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ابو الفتح المعروف سلطان ٹیپو شہید کر دیئے گئے۔ دہلی پر مرہٹے یلغار کر رہے تھے اور پنجاب میں سکھ زور پکڑ رہے تھے۔ ۱۸۰۰ء کے آخر تک انگریز تمام قابلِ ذکر طاقتوں کو شکست دے کر دہلی پر پہنچ چکے تھے۔

مخالفین جب غنڈہ گردی، دھونس اور اذیتیں دے کر بھی شاہ عبدالعزیز کو اپنے مشن سے باز نہ رکھ سکے تو انہوں نے ان کا گھر ضبط کرا دیا اور شاہ عبدالعزیز کو ان کے اہل خانہ سمیت شہر بدر کرا دیا۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے فتوے کے ذریعے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا۔ انہوں نے اپنے والد شاہ ولی اللہ کی فکر کو بنیاد بنا کر انگریزوں سے نجات حاصل کرنے اور مسلمانوں کے لیے دار الامان کے قیام کی جدوجہد شروع کر دی، پھر وہ وقت بھی آیا جب مرہٹوں اور مسلمانوں کی پرانی دشمنی ختم ہو گئی۔

اب مرہٹوں کے علاقے سے مسلمان باقاعدہ طور پر ان کی فوج سے میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑنے لگے۔ سید احمد شہیدؒ ۱۸۲۹ء میں پشاور پر قابض ہو گئے اس طرح انہوں نے ایک آزاد مسلم ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ اگرچہ اس ریاست کی زندگی بہت مختصر تھی۔ ان کے معتقد خاص نثار علی عرف تیتو میر نے بنگال میں انگریزوں

کے خلاف بغاوت کر دی۔

شاہ ولی اللہ کے پیروکار ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام بند کرانے کے لیے مسلسل مصروف عمل رہے۔ بعد ازاں صادق پور کے مجاہدین نے اس جہاد کا پرچم سنبھال لیا۔

شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی کی ایک عظیم جنگ لڑی۔ اس جنگ میں لاکھوں مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو شدید مظالم کا نشانہ بنایا اور اُنہیں خوب تباہ و برباد کیا۔

ہندوستان میں مسلمان آزادی کی آئینی جنگ میں مشغول تھے تو سرحد کے علاقے میں شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی کی مسلح جدوجہد میں مصروف تھے۔

آزادی کی اپنی کوششوں کے نتیجہ میں بیسیوں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں برطانوی استعمار کے خلاف ریشمی رومال کی انقلابی تحریک برپا ہوئی۔ اس تحریک کے محرک اور بانی مولانا محمود حسن تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کے انتقال کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی عسکری جدوجہد بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

زیر نظر کتاب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تک ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ کی جدوجہد آزادی کا مختصر سا جائزہ ہے۔ یہ کتاب راقم نے استاذ مکرم جناب نفیس الحسینی کی تحریک پر ترتیب دی۔ انھوں نے اسے دیکھا اور اصلاح فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی بساط کے مطابق کتاب کی تیاری کے تمام تر امور میں پوری پوری احتیاط کی ہے۔ اگر کہیں غلطی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ نیز نشاندہی کے لیے ہم۔ بے حد شکر گزار ہوں گے۔



تعارف

نحمده تبارك و تعالىٰ ونصلي و نسلم على رسوله الكريم و على آله و أصحابه و أتباعه أجمعين

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز کو برصغیر پاک، ہندو بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں دو اہم حوالوں سے سنگم کی حیثیت حاصل ہے، اس حوالہ سے بھی کہ وہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنوبی ایشیا میں اٹھنے والی مسلح تحریکوں میں آخری ملک گیر تحریک کے قائد تھے جو ریشمی رومال تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے، یہ تحریک اگر اپنے پروگرام کے مطابق بپا ہو جاتی تو آج نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام کا نقشہ کچھ اور ہوتا لیکن یہ تحریک قبل از وقت راز فاش ہونے کی وجہ سے ناکام ہوگئی، اس کے بعد مسلح جدوجہد سے ہٹ کر پر امن سیاسی تحریکات اور عدم تشدد پر مبنی جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو اس کا نقطۂ آغاز بھی حضرت شیخ الہندؒ تھے کہ انہی کے فتویٰ کی بنیاد پر ترک موالات کی سیاسی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔

شیخ الہند ایک اور حوالہ سے بھی تحریک آزادی کا سنگم ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دیوبند اور علی گڑھ میں جنم لینے والی دو فکری اور علمی تحریکوں نے جس سفر کا آغاز الگ الگ زاویوں سے کیا تھا اور وہ بظاہر ایک دوسرے سے معارض نظر آ رہی تھیں شیخ الہندؒ کی ذات پر سیاسی جدوجہد کے حوالے سے وہ مجتمع ہوگئی تھیں چنانچہ شیخ الہندؒ کے افکار کا پرچم اٹھانے والوں میں جہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ جیسے عظیم علماء نظر آتے ہیں

دہاں حکیم اجمل خانؒ مولانا محمد علی جوہرؒ اور ڈاکٹر انصاریؒ جیسے جدید تعلیم یافتہ اور علی گڑھ سے تربیت پانے والے اساطین بھی اسی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

شیخ الہندؒ دراصل امام ولی اللہ دہلویؒ کی عظیم علمی وفکری جدوجہد اور ان کے قافلہ کی تگ ودو کے تسلسل کے امین تھے جنہوں نے اپنے دور میں اسے عروج تک پہنچا دیا اور میرے نزدیک تاریخ کی زبان میں حضرت شیخ الہندؒ کا یہی سب سے بڑا تعارف ہے۔ ہمارے فاضل صحافی دوست جناب ظہور الدین بٹ نے اسی داستان کو اپنی زبان میں بیان کیا ہے اور نئی نسل کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اگر آج آزادی کا سانس لے رہی ہے تو اس کے پیچھے کن لوگوں کی محنت اور خون شامل ہے۔

آج جبکہ عالم اسلام ایک نئے استعمار کی یلغار کے نتیجے میں پھر اسی دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اب سے ایک صدی قبل وہ برطانوی استعمار کے حوالے سے کھڑا تھا' ظہور الدین بٹ صاحب کی یہ کاوش نئی نسل کو ماضی کے پس منظر میں راہ نمائی مہیا کرنے کی ایک مبارک سعی ہے جس پر وہ شیخ الہندؒ کے خوشہ چینوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

ابو عمار زاہد الراشدی خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۲۴ جون ۲۰۰۶ء



برعظیم پاک وہند کا سیاسی پس منظر

مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے ساتھ ہی برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی حکومت کا سنہری دور اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ہندوستان کا مضبوط اور مستحکم مرکز منتشر ہو کر رہ گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف ریاستوں اور صوبوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح برعظیم پاک وہند میں مغل بادشاہت ختم ہو گئی۔

یہ وہ دور تھا جب برطانوی عفریت نے دنیا کے مختلف علاقوں خصوصاً برعظیم پاک وہند پر قبضہ جمانے کیلئے اپنے دانت تیز کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ہندوستان کے کمزور مرکز اور صوبوں اور ریاستوں کے اعلان خود مختاری نے برطانوی سامراج کو گل کھلانے کا بہترین موقع فراہم کیا۔

ہندوستان میں تجارتی اغراض کے تحت پہنچنے والے انگریزوں نے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کو غلام اور اپنی کالونی بنانے کیلئے جدوجہد شروع کر دی. ابتدا میں ہندوستان کے بعض صوبے داروں (حاکموں) اور والیان ریاست نے انگریزوں کی ان حرکات کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور برطانوی غاصبوں کو ہندوستان سے نکالنے کی کوششیں کیں۔

ان حریت پسندوں میں نواب سراج الدولہ اور ابوالفتح المعروف سلطان ٹیپو شہید بن حیدر علی کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کی جدوجہد ہندوستان میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکنے اور مسلمانوں کی حکمرانی کی بحالی کے لیے تھی۔

شاہ ولی اللہؒ

شاہ ولی اللہؒ نے برعظیم پاک و ہند میں اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے اقتدار کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ عالمگیر کے انتقال سے صرف چار سال قبل ۱۷۰۳ء بمطابق ۴شوال ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔

دہلی کے تخت کے حصول کیلئے کھیلے جانے والے ڈرامے آپ نے نوعمری میں ہی دیکھنا شروع کر دیئے تھے جس نے آپ کی طبیعت کو نہایت درجہ حساس بنا دیا تھا۔ اللہ نے آپ کے قلب کو درد اور نظر کو دور رس بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہی اوصاف کی بنا پر آپ نے ۳۰ سال سے کم عمر کے زمانہ میں حج کا ارادہ کیا جو آپ کی روح کیلئے شفا اور درد کیلئے تسکین ثابت ہوا۔ ۱۷۳۰ء میں آپ حجاز تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں دو سال قیام فرمایا اور اس عرصہ میں اپنی روحانی اور علمی تشنگی دور فرمائی۔

اس قیام کے دوران حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یورپ' افریقہ اور ایشیائی زائرین سے ان ممالک سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں اور اس دور کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ترکی (سلطنت عثمانیہ) کے اندرونی معاملات کا بغور جائزہ لیا۔

ترکی' یورپ' افریقہ اور ایشیائی ممالک کے تنقیدی مطالعہ نے آپ پر واضح کر دیا کہ وہ تمام خرابیاں جو دنیائے اسلام کو روز بروز تباہی اور بربادی کی جانب گھیرے لیے جارہی ہیں وہ اُن کی ملوکیت اور شاہ پرستی ہے جو کسی زمانہ میں سودمند ہی ہوگی مگر اب یہ نظام اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے فوری طور پر اس نظام کو پاش پاش کرنے

کا عظیم فیصلہ کیا۔ آپ مکہ معظمہ میں ہی قیام فرماتے تھے جب آپ کے ضمیر نے پرانے نظام کے خاتمے اور ایک نئے ''انقلابی پروگرام'' کا جرس سنایا۔

اس انقلابی پروگرام کے پہلے مرحلے میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے آپ نے ایک مرتبہ پھر برعظیم پاک و ہند اور بیرونی دنیا کے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ خرابیوں کی نشاندہی کی' بڑے بڑے جاگیرداروں' امراء' نوابین اور بادشاوں پر آپ نے ان خرابیوں کو واضح کیا جو اس پرانے اور فرسودہ نظام کے نقیب تھے۔

آپؒ نے ان قباحتوں اور برائیوں کو نہ صرف ان پر واضح کیا بلکہ انہیں مستقبل میں پیش آنے والے متوقع نتائج سے بھی آگاہ کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کے انقلابی معاشی نظریات

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف حجۃ اللہ البالغہ میں ان انقلابی نظریات اور اصولوں کی نشاندہی بھی کی جو قومی تعمیر نو کے سلسلہ میں آئندہ بنیاد کے طور پر استعمال کیے جانے تھے۔

آپ نے اس دور میں پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے یہ انقلابی معاشی نظریہ پیش کیا کہ ''دولت کی اصل بنیاد محنت ہے''۔ مزدور اور کاشتکار ہی اصل قوت کاسبہ ہیں۔ ان کا باہمی تعاون ہی قومی ترقی کی اولین شرط ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک و قوم کیلئے کام نہ کرے ملکی دولت میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔

اس طرح آپؒ نے پہلی مرتبہ مزدور اور محنت کش کو اس کے حقیقی مقام اور مرتبہ سے آگاہ کیا۔ یہی اصول بعد ازاں کمیونزم کے پرچارک کارل مارکس نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔[1]

شاہ ولی اللہؒ نے حکمرانوں پر زور دیا کہ ملک سے جوا' سٹہ اور عیاشی کے تمام اڈے ختم کر دیئے جائیں۔ آپؒ کے نزدیک ان برائیوں کی موجودگی میں معاشرے کی اصلاح کے لیے صحیح نظام قائم نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی ایسا کیے بغیر ملک و قوم کی دولت

[1] حجۃ اللہ البالغہ: باب سیاست المدینہ البدور البازغہ بحث الارتفاق الثالث اور الخیر الکثیر۔

میں اضافہ ممکن تھا۔ شاہ ولی اللہؒ کا خیال تھا کہ اس طرح دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔[۲]

شاہ ولی اللہؒ نے مزدوروں، کاشتکاروں اور دیگر محنت کشوں، بشمول اساتذہ اور دانشوروں پر زور دیا کہ وہ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کیلئے کام کریں۔ ان کے نزدیک پیدائش دولت کے ذمہ دار اور مستحق ایسے ہی لوگ ہیں۔

انہوں نے فرمایا ''محنت کشوں، مزدوروں اور کاشتکاروں کی ترقی اور خوشحالی ہی درحقیقت ملک و قوم کی خوشحالی ہے اور سابقہ نظام جو فرسودہ ہو چکا ہے اگر اس فرسودہ نظام نے انقلابی قوتوں (کاشتکاروں، مزدوں محنت کشوں اور دانشوروں) کو دبانے کی کوشش کی تو اس کا ایسا کرنا ملک کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ اس لیے انہوں نے مروجہ فرسودہ نظام کو ختم کر دینے پر زور دیا۔[۳]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حکمرانوں کو نوشتہ دیوار پڑھاتے ہوئے کہا، ''جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، کاشتکاروں، مزدوروں اور محنت کشوں پر بھاری ٹیکس نافذ کرے، ایسا سماج قوم کا دشمن ہے اور اسے ختم ہو جانا چاہیے''۔[۴] آپ نے فرمایا: ''ضرورت مند مزدور کی رضا مندی قابل اعتبار نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس کی محنت کا وہ معاوضہ ادا نہ کیا جائے جو امداد باہمی کے اصول کے تحت لازم آتی ہے۔[۵]

انہوں نے کہا: ''ایسی پیداوار اور آمدنی خلاف قانون ہے جو تعاون باہمی کے تحت حاصل نہ کی گئی ہو''۔[۶]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ انقلابی اصول بھی واضح کیا کہ ''مزدوروں کے اوقات کار محدود کیے جائیں۔ انہیں اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے وقت اور مواقع فراہم کیے جائیں۔ نیز ان میں اپنے مستقبل سے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنے کا

---

۲ حجۃ اللہ البالغۃ: باب ابتغاء الرزق ۳ حجۃ اللہ البالغۃ: باب ابتغاء الرزق

۴ حجۃ اللہ البالغۃ: باب سیاست المدینہ

۵ حجۃ اللہ البالغۃ: باب الرسوم السائرۃ بین الناس ۶ حجۃ اللہ البالغۃ: باب ابتغاء الرزق

شعور بھی پیدا کیا جائے''۔[۷]

آپ نے سماج پر واضح کیا کہ ''تجارت کیلئے باہمی تعاون ناگزیر ہے'' اس لیے تجارت کو تعاون کے مسلم اصولوں پر جاری رہنا چاہیے۔ جس طرح تاجروں کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط کمپی ٹیشن (Competition) کے ذریعے روح تعاون کو ضعف پہنچائیں۔ بعینہ حکومت کیلئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تاجروں اور صنعتکاروں پر بھاری ٹیکس عائد کر کے تجارت کے فروغ اور ترقی کی راہ میں رخنہ یا رکاوٹ پیدا کرے''۔[۸]

نیز انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''کوئی کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ تک محدود کر دے تو ایسا ارتکاز (دولت کا چند ہاتھوں میں جمع ہو جانا) ملکی معیشت کیلئے تباہ کن ہے۔[۹]

انہوں نے واضح طور پر سماج کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ''شاہانہ نظام زندگی جس میں چند افراد یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے باعث دولت کی منصفانہ تقسیم میں خلل پیدا ہو تو ایسی صورت میں سماج میں مروجہ نظام کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کو اس عذاب (نظام) سے نجات دلانا لازم ہے تا کہ عوام کو مساویانہ نظام زندگی قائم کرنے کا موقع فراہم کیا جائے''۔[۱۰]

شاہ ولی اللہؒ نے معاشی اصولوں میں ایک یہ اصول بھی واضح کیا کہ ''زمین کا حقیقی مالک اللہ (اور سیاسی نظام کے اعتبار سے ریاست) ہے۔ رہا عوام کی حیثیت مسافر خانوں میں سکونت پذیر مسافروں کی سی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حق انتفاع میں دوسروں کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے''۔[۱۱]

---

۷ حجۃ اللہ البالغۃ: باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم و باب ضبط المبہم

۸ حجۃ اللہ البالغۃ: باب البیوع المنہی عنہا۔

۹ حجۃ اللہ البالغۃ: باب الارتفاق الرابع و باب البیوع المنہی عنہا۔

۱۰ حجۃ اللہ البالغۃ: باب الرسوم السائرہ بین الناس و باب سیاست المدینہ و ایضاً باب ابتغاء الرزق و باب البیوع المنہی عنہا۔ ۱۱ حجۃ اللہ البالغۃ: ابتغاء الرزق

شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی نظریات و بنیادی حقوق

شاہ ولی اللہؒ نے ریاست کے سربراہ کو کسی وقف کے متولی کی حیثیت دیتے ہوئے کہا کہ "حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ ریاست کا سربراہ اس زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نمائندہ ہے"۔

کسی وقف (ریاست) کے متولی کی حیثیت سے اگر وہ (ریاست کا سربراہ) ضرورت مند ہے تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے جس سے وہ ریاست کے ایک عام شہری کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

انہوں نے کہا کہ "سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مالک ملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک گردانے، نہ کسی کیلئے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ، انسان پر انسان کی حکومت اور مطلق العانیت کے خلاف تھے۔ انہوں نے کسی ایسے سربراہ مملکت کی حمایت نہیں کی جو آمر یا بادشاہ کہلانا پسند کرے۔

آپؒ نے حجۃ البالغۃ اور البدور البازغۃ میں تحریر فرمایا ہے:

۱۔ "روٹی کپڑا، مکان اور اتنی استطاعت کہ کوئی شخص (شہری) شادی کر سکے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر سکے۔ بلا لحاظ مذہب و نسل، ریاست کے ہر انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔"

۲۔ "ریاست کا فرض ہے کہ وہ کسی نسل، رنگ یا مذہب کا فرق کیے بغیر تمام شہریوں

کے معاملات میں یکسانیت سے ان کے ساتھ عدل کرے، اُن کے جان و مال کی بلاتمیز حفاظت کرے، ان کی عزت و ناموس کے تحفظ کا بندوبست کرے۔ حق ملکیت کی آزادی دے، ریاست کے تمام شہریوں کو بلاتمیز رنگ، مذہب و نسل یہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں جبکہ اپنی زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا، متعلقہ طبقہ یا فرقہ کا بنیادی حق ہے۔"

ان بنیادی حقوق کے تحفظ کیلئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ خود مختار علاقے (ریاستیں) بنائیں جائیں جو اپنے معاملات میں آزاد ہوں۔ ہر اکائی یا یونٹ (ریاست) اتنا طاقتور ہو کہ وہ اپنے جیسے کسی دوسرے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔

یہ تمام اکائیاں یا یونٹ (ریاستیں) ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک یا تنظیم) سے منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے اعتبار سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو، اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ کسی مخصوص مذہب یا تہذیب کے کسی یونٹ پر حملہ کر سکے۔

شاہ ولی اللہؒ کے دینی نظریات

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا:

۱۔ داعیان صداقت (ریفارمر، مصلح) ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں۔ ان سب کا احترام لازمی ہے۔

۲۔ دین اور سچائی کی بنیاد ایک ہی ہے۔ اس کے پیش کرنے والے ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔

۳۔ سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً یکساں طور پر تسلیم شدہ ہیں مثلاً ہر ایک مذہب کے پیروکاروں کا اپنے پروردگار کی عبادت کرنا، اس کے لیے نذر نیاز دینا، صدقہ و خیرات کرنا۔ اسے خوش کرنے کے لئے روزہ رکھنا وغیرہ، یہ تمام کام سب کے نزدیک افضل ہیں البتہ ان کی عملی صورتیں جدا جدا

ہیں۔

۴۔ عالم انسانی کے سماجی اصول اور ان کے مقاصد ایک ہیں۔ ہر مذہب جنسی انارکی (بے راہ روی) کو ناپسند کرتا ہے اور اسے اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلقات کیلئے عورت و مرد میں ایک سماجی معاہدہ ضروری ہے البتہ اس معاہدے کی مختلف معاشروں اور مذاہب میں مختلف صورتیں ہیں۔ اس طرح مختلف مذاہب میں اپنے فوت ہونے والوں کو نظروں سے اوجھل کرنے کے لئے انہیں دفن کیا جاتا ہے یا جلایا جاتا ہے۔

۵۔ جہاد ایک مقدس فرض ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مقدس اصولوں کے نفاذ کیلئے انسان اپنے اندر فدائیت کا جذبہ پیدا کرے یہاں تک کہ وہ ان مقاصد کے حصول کیلئے اپنی عزیز ترین اشیاحتیٰ کہ زندگی کو بھی فنا کردے۔



اٹھارویں صدی کا ہندوستان

۱۷۰۷ء کے بعد کے حالات

تخت دہلی کے حصول کے لیے صرف پچاس سال کی مختصر مدت میں تخت وتختہ کے دس تماشے ہو چکے تھے۔ وہ عناصر جنھوں نے تخت دہلی کو بازی گاہ عروج وزوال بنایا ہوا تھا مملکت ہندوستان کی تقدیر کے مالک بن کر دارالسلطنت دہلی پر قابض تھے۔ کسی کو ان کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور سیاست عوامی ان کے لیے زہر ہلاہل تھی۔

ان نامساعد حالات میں جب شاہ ولی اللہؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ اس وقت کی سرکاری ودفتری زبان فارسی میں کیا تو علماء جاہ پرست ان کی جان کے دشمن ہوگئے۔ ان جاہ پرست علماء کا خیال تھا کہ جب دفتروں کے محرر اور عام لوگ بھی قرآن پاک کا مطلب سمجھنے لگ جائیں گے تو ایسے علماء کی ہاں میں ہاں ملانے والا کون ہوگا اور کیا ان کی عزت وشان وشوکت خاک میں نہ مل جائے گی؟

غیظ وغضب کے ایسے جذبات کے زیر اثر بعض جاہ پرست علماء نے حضرت مجدد شاہ ولی اللہؒ پر قاتلانہ حملہ کرایا مگر خدا کے فضل سے وہ اس حادثے میں بالکل محفوظ رہے اور غنڈے ان کا بال بیکا بھی نہ کر سکے۔

اس پرآشوب دور میں جب تخت دہلی کے لال قلعہ میں گردن زنی اور رسم تاج پوشی کے تماشے اتنے پر ہیجان اور وحشت انگیز تھے کہ ان حالات میں کوئی بامقصد کام کرنا تو درکنار مثبت خطوط پر سوچنا اور رائے قائم کرنا بھی محال تھا۔

سیاست کے خون بار میدان میں مرہٹے جو اورنگزیب عالمگیر کے دور میں جنوبی ہند میں شکست خوردہ ہونے کے بعد دبک گئے تھے ایک بار پھر اس کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد انہوں نے اپنے پر نکالنے شروع کر دیئے۔

دہلی کی جانب مسلسل پیش قدمی کرتے ہوئے صرف تیس ۳۰ سال کی مختصر مدت کے بعد مرہٹے فاتحانہ انداز میں ۱۷۳۶ء میں دہلی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے چند یوم تک دہلی میں قیام کیا۔ بادشاہ سے اپنی مرضی کے عین مطابق معاہدہ کیا اور واپس ہو گئے۔[1]

اس واقعے کے دو سال بعد فروری ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ بادشاہ نے دہلی پر زبردست حملہ کیا۔ چند گھنٹوں کے قتل عام میں دہلی کے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس قتل عام میں آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ عوام کو کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ بائیس کروڑ روپیہ نقد خزانہ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ روپے کے زیورات، جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ شاہی محلات سے لوٹے گئے۔[2]

دہلی پر نادر شاہ کے دہشت ناک حملے کے تقریباً بارہ سال بعد ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی کا مشہور معرکہ "پانی پت کی جنگ" وقوع پذیر ہوا۔ اس واقعے سے اگلے سال ۱۷۵۲ء میں سورج مل جاٹ نے پرانی دہلی کو لوٹا۔[3] ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کے مطابق جب جاٹوں نے لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے پریشانی اور گھبراہٹ میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، وہ دربدر گلی گلی مارے پھرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ ہر شخص پاگلوں کی طرح پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔[4]

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد دوئم صفحہ ۵۵ حاشیہ نمبر ۱

[2] تاریخ ہندوستان از شمس العلماء ذکا اللہ خان جلد نمبر ۹ صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹، وسیر المتاخرین اور شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۴، ۲۵۔ [3] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: مرتبہ خلیق احمد نظامی، صفحہ ۱۷۷

[4] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات سے صفحہ ۱۷۷ اور چہار گلزار شجاعی مصنف ہرچرن داس صفحہ ۴۱۰، ۱۳ (قلمی نسخہ)

شاہ ولی اللہؒ کا وصال

برعظیم پاک و ہند کے عظیم انقلابی رہنما، مجدد وقت اور بطل جلیل حضرت شاہ ولی اللہؒ ساٹھ سال کی عمر (۱۷۶۳ء) میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی دفات کے بعد شاہ عبدالعزیز جو آپ کے خلیفہ ارشد بھی تھے اور خلف رشید بھی، نے آپ کے عظیم مشن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔

انتہائی نوعمری (سترہ سال کی عمر) میں قدرت نے شاہ عبدالعزیز کے کندھوں پر ایک انتہائی نازک اور اہم ذمہ داری ڈال دی تھی۔ انہوں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز اسی جگہ سے کیا جہاں پر ان کے عظیم باپ نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

مئی ۱۷۵۷ء برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کا وہ تاریک دور ہے جب نواب سراج الدولہ کا خون جنگ پلاسی میں بہا۔ اس عظیم حریت پسند اور فرنگ دشمن سپوت کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ دوسری جانب برطانوی امپریل ازم کا عفریت ہندوستان پر اپنے پنجے گہرے گاڑتا جا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی فتح و کامرانی سے سرشار تھی اور مشرق میں اس کا عروج روز افزوں تھا۔ نیز دہلی مرہٹوں کا جولان گاہ بنا ہوا تھا۔

مرہٹوں کے سردار رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ لشکر جرار کے ساتھ دہلی پہنچے، عالم گیر ثانی، بادشاہ دہلی اور وزیر اعظم نجیب الدولہ محصور ہو گئے۔ ستائیس روز تک توپوں کے گولے دہلی پر برستے رہے بالآخر راجہ ہلکر کو عالمگیر ثانی نے بہت سی رشوت دی تب محاصرہ سے نجات ہوئی۔[5]

سلطنت دہلی کی سیاسی بساط ۱۷۸۲ء تک بالکل بدل چکی تھی۔ مرہٹوں کے پیشوا مادھو نرائن مغل بادشاہ کے امیر الامراء، اور مادھو جی سندھیا نائب امیر الامراء مقرر ہو چکے تھے۔ اس طرح سلطنت مغلیہ کے محافظ مرہٹے قرار پائے۔

اٹھارویں صدی کی شام کو ہندوستانی عظمت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، غلامی کی

---

[5] تاریخ ہندوستان ذکا اللہ خان جلد ۹ صفحہ ۲۹۸

شب تاریک تیزی سے پورے ملک پر چھا رہی تھی اور انگریزی اقتدار کی صبح صادق نمودار ہو رہی تھی۔[6]

مسلمانوں کی تمام قابل ذکر طاقتیں ختم ہو چکی تھیں، جو ختم نہ ہوئیں تھی مفلوج ہو کر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ ۱۸۰۰ء کے آخر میں لارڈ لیک انگریزی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں، وہ سینہ سپر ہوئیں مگر انگریز کی فوجی طاقت مرہٹوں کے قوت ایثار سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، مجبوراً شکست خوردہ دہلی نے انگریزوں کا استقبال کیا۔ لارڈ لیک نے دہلی پر تسلط کر کے شاہ عالم سے ایک نیا معاہدہ کیا۔[7]



۶ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد دوئم صفحہ ۶۷

۷ ایضاً

شاہ عبدالعزیزؒ

ایک عظیم مجدد باپ کے مجدد سپوت نے اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہمہ گیر انقلاب ''فک کل نظام'' کے تصور کو عام کرنے اور اس تصور کے مطابق عوام کی تربیت کے لیے تین طریقے اپنائے۔

درس و تدریس

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے دادا شاہ عبدالرحیم کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ جب شاہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف و اکناف سے آنے لگے تو محمد شاہ بادشاہ نے ایک عالیشان مکان مدرسہ کو دے دیا جس نے بعد ازاں یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر لی۔

یہ ۱۸۵۷ء تک اپنی اسی حالت پر قائم رہا مگر بعد ازاں ہنگاموں میں یہ مدرسہ مٹ گیا اور اس کی زمین ضبط کر لی گئی۔[1] یہاں درس و تدریس کا یہ عالم تھا کہ پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہ تھا جس کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق حضرت شاہ عبد العزیز سے نہ ہو۔[2]

روحانی تربیت

روحانی تربیت کیلئے صوفیا کرام کے طریقے اپنائے گئے۔ طالبان حق کو عملی طور پر

۱ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد دوئم صفحہ ۳۹، ۴۰ (دونوں صفحوں پر حاشیے دیکھیں)

۲ ایضاً (صفحہ ۳۹، ۴۰)

اس بات کا عادی بنایا گیا جس کی انہیں تعلیم دی جاتی تھی۔ خود غرضی' نفس پرستی اور اقتدار پسندی جیسی صفات سے دلوں کو پاک کیا گیا۔ صبر وضبط' محنت و جفاکشی' محبت وشفقت اور ہر مادی غرض سے بالا' مخلوق خدا کی خدمت اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا گیا۔ نہ صرف شاہ عبدالعزیز بلکہ ان کا تمام گھرانہ ان صفات میں کمال یکتا رکھتا تھا۔

اجتماعات سے خطاب

شاہ عبدالعزیز اپنے والد کے پیغام کو ہر کس و ناکس تک پہنچانے کے لیے عام جلسوں اور اجتماعات سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ ہفتہ میں دو مرتبہ عام اجتماع سے ضرور خطاب کیا کرتے تھے۔ دہلی اور بیرون دہلی کے ہزاروں آدمی ان اجتماعات میں شرکت کرتے۔ پروگرام کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ زندگی کے آخری لمحہ تک اور قوت گویائی کی طاقت قائم رہنے تک وہ اس قسم کے اجتماعات میں تقریر کرتے رہے۔

علماء کی تربیت

آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا پیغام چارسو پہنچانے کے لیے علماء کرام کی تربیت کی جنہوں نے بعد ازاں حضرت مجدد کے انقلابی پروگرام ''فک کل نظام'' کے تحت ''جنود ربانیہ'' قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسے علماء کی فہرست خاصی طویل ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

شاہ عبدالعزیز نے جن تاریخی مقاصد کے حصول کے لیے اپنے والد محترم سے ذمہ داری وراثت میں قبول کی تھی اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کو ذہن نشین کرانا۔

۲۔ خدا پرستی' خوف خدا اور پاک بازی کا سچا جذبہ پیدا کرنا۔

۳۔ ملوکیت اور شاہ پرستی کے جراثیم کو دماغوں سے نکالنا۔

۴۔ جذبہ فدائیت' یعنی نصب العین کے لیے قربان ہونے کا شوق پیدا کرنا۔

۵۔ خدمت خلق' بالخصوص نوع انسانی کی ہمدردی' غم خواری اور خود تکلیف اٹھا کر دوسرے کو آرام پہنچانے کا عادی بنانا۔

۶۔ شاہانہ تکلفات ختم کرنا اور سادہ زندگی کا عادی بنانا۔

۷۔ فوجی سپرٹ (جذبہ) پیدا کرنا' جفاکشی' محنت اور ہر قسم کے حالات برداشت کرنے کا عادی بنانا۔

۸۔ ایسی رسومات کو بند کرانا جو سوسائٹی کو پستی کی طرف لے جا رہی ہوں۔

۹۔ عیاشی کے اڈے ختم کرنا' ایسے تمام جراثیم کی اصلاح کرنا جو سوسائٹی کو عیش پرست' آرام طلب اور پست ہمت بنا رہے تھے۔[۳]

مغل بادشاہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا بے پناہ احترام کرتے تھے مگر انیسویں صدی کے آغاز تک وہ خود اپنے اختیار میں نہ رہ گئے تھے۔ جو کار پرداز' با اختیار تھے ان میں سے اکثر کو آپ کی پیش کردہ اصلاحات ناپسند تھیں اور بعض انگریزوں کے ایجنٹ ہونے کے سبب شاہ عبدالعزیز اور ان کے ساتھیوں کو اذیتیں اور تکالیف پہنچانا' اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں میں نجف خان سرفہرست تھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے مخالفین جب غنڈہ گردی' دھونس اور تکالیف سے انہیں اپنے مشن کی تبلیغ سے نہ روک سکے تو ان کا مکان ضبط کرا دیا گیا' آپ کو مع اہل وعیال شہر بدر کرا دیا گیا۔ اسی پر قناعت نہ کی گئی اور دو مرتبہ آپ کو زہر دیا گیا۔[۴] خدا کے فضل سے ان کے خلاف یہ سازشیں ناکام رہیں مگر اس سے آپ کی جسمانی صحت پر برا اثر پڑا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کے بدن پر چھپکلی کا ابٹن مل دیا گیا تھا جس سے آپ کو برص ہو گیا۔ غرضیکہ ان اذیتوں کے باعث آپ کی بینائی جاتی رہی' خون میں حدت[۵] پیدا ہو گئی اور آپ کو مختلف امراض لاحق ہو گئے۔

---

۳ علماء ہند کا شاندار ماضی: صفحہ ۳۹

۴ امیر الروایات' ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۴' علماء ہند کا شاندار ماضی' حاشیہ صفحہ ۴۶ پر۔

۵ ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۴

برطانوی مدبرین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قابض ہونے کے بعد ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت اور ہندوستانی عوام کی مغل شہنشاہیت سے حد درجہ عقیدت کے پیش نظر بادشاہ کو معزول کرنے اور اسے تخت و تاج سے محروم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ برعکس اس کے انہوں نے بادشاہت کا وہی نمونہ پیش کیا جس کے تحت برطانیہ کی پارلیمان نے بادشاہ کو تاج و تخت کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے تمام اختیارات پارلیمان کو دے دیئے تھے۔

ہندوستان میں بھی اب حکم کمپنی بہادر کا رہ گیا تھا جبکہ ملک بادشاہ سلامت کا تھا۔ اس کی تعبیر اور اعلان کچھ اس طرح ہوا کرتا تھا پنڈت کیفی بتاتے ہیں کہ ''بہادر شاہ بغیر ملک کے بادشاہ تھے لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور اقتدار وہی تھا جو ان کے بزرگوں کا رہ چکا تھا۔

اگرچہ صرف قلعہ کی چار دیواری اور مختصر سے علاقے خالصہ میں بادشاہ کی حکومت تھی لیکن اس پر بھی شہر والے کمپنی کے افسروں کے خلاف اپنی شکایتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔''[۶]

اس دور میں جب مذہب' تہذیب اور بادشاہ تینوں محفوظ تھے' ایک انتہائی نازک سوال پیدا ہو گیا کہ موجودہ حالت کو آزادی کہا جائے یا غلامی۔ اسلامی قوانین کی رو سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اب ہندوستان کو دار السلام مانا جائے جیسا کہ پہلے تھا یا دار الحرب کہا جائے جہاں برسر اقتدار طاقت سے جنگ کرنا' ورنہ اس ملک سے نکل جانا مذہباً فرض ہے یا اس کو دار الامن مانا جائے جہاں اگرچہ حکومت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے اور مذہبی آزادی ان کو حاصل ہے اور اس بنا پر حکومت سے جنگ کرنا درست نہیں ہے۔[۷]

ان حالات میں شاہ عبد العزیز نے جو فتویٰ فارسی زبان میں صادر فرمایا اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

۶۔ صحافت پاکستان و ہند میں صفحہ ۹۲ ۷۔ علماء ہند کا شاندار ماضی: صفحہ ۸۷

''یہاں رؤسا نصاریٰ (عیسائی افسران) کا حکم بلا غرض اور بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری' انتظامات رعیت' خراج' باج' عشر و مال گزاری' اموال کی تجارت' ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات' مقدمات کا تصفیہ' جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول' فوج' پولیس' دیوانی اور فوجداری معاملات' کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہیں۔

ہندوستانیوں کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نماز جمعہ' عیدین' اذان اور ذبیحہ گاو جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے وہ (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حیثیت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آ سکتا۔

عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔

دہلی سے کلکتہ تک انہیں عملداری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد' لکھنؤ' رام پور میں چونکہ وہاں کے فرمان رواوں نے اطاعت قبول کر لی ہے' براہ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ (مگر اس سے پورے ملک کے دار الحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا) (فتاویٰ عزیزی فارسی جلد اول صفحہ ۱۷ مطبوعہ مطبع مجتبائی)۔

اسی طرح شاہ عبد العزیزؒ نے ایک دوسرے فتویٰ میں بھی مخالفوں کے اعتراضات

کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کو دار الحرب ہونا ثابت کیا ہے۔ (جلد اول صفحہ ۱۰۵ فتاوئی عزیزی فارسی مطبوعہ مطبع مجتبائی)

فتوئی کی زبان مذہبی ہے کہ ''دار الحرب'' کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر روح سیاسی ہے اور مطلب یہ ہے

''چونکہ قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ مذہب کا احترام ختم ہے اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے لہٰذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کرے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔[۸]

شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاوئی صادر کرنے کے بعد مسلمانوں کا جنگ جو طبقہ جو آپ کے خاندان سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا اور جن میں روہیلہ پٹھان خصوصی طور پر شامل تھے ان کے تعلقات کے مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔

دوسری طرف عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے اب تک حیرت زدہ تھے اور اپنے اندر مذہب کی روشنی میں فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا۔ جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت طبقہ انگریزوں کے خلاف مرہٹوں سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسر پیکار تھے۔

اس دور میں مرہٹوں اور مسلمانوں کے درمیان پرانی دشمنی اور جنگ ختم ہو گئی۔

مرہٹہ علاقوں کے مسلمان باقاعدہ طور پر ان کی قوم میں شامل ہو کر آخر دم تک انگریزوں سے لڑتے رہے جبکہ شمالی ہند کے بے شمار مسلمان بھی ان علاقوں میں پہنچے اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔

خود شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمدؒ کو امیر علی خان سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت کے خلاف گوریلا طرز کی جنگ میں مصروف تھے۔

۸ افتاوئی عزیزیہ مطبوعہ مطبع مجتبائی صفحہ ۱۷ ج اول

۹ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۸۱

انقلاب

حضرت شاہ ولی اللہؒ جو بیک وقت عالم، مصلح اور سیاست دان تھے انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور ہندوستان کی سیاسی بساط جو اس وقت مغل بادشاہوں کے لیے الٹ چکی تھی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

ان کی سیاسی بصیرت اور مستقبل بینی نے ان پر منکشف کر دیا تھا کہ برعظیم پاک وہند میں ''مسجد'' جو بیک مدرسہ بھی ہوا کرتا تھا کو آزادی کا عظیم مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اسی بنا پر انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایسے مدرسے قائم کیے جو ان کی وفات کے بعد ہندی حریت پسندوں کے مراکز بنے رہے۔ ایسے مراکز کا ذکر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ عدم تشدد کے قائل تھے اور نہ اہنسا کے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان میں سیاسی اور فکری انقلاب صرف طاقت اور تبلیغ کے زور پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ ایسی فوجی طاقت سے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس میں حریت پسندوں کی تربیت ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے اصولوں پر کی گئی ہو نہ کہ دشمنی اور غارت گری کی بنیاد پر۔

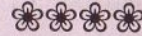
یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد جب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد محترم کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو ہاتھ میں لیا تو انہوں نے انقلابیوں کی تربیت محنت، جفاکشی، صبر و استقلال، ایثار اور قربانی کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کی۔

ان انقلابی مسلمانوں نے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے زیر تربیت رہے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کو خیر باد کہہ کر ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے میدان عمل میں نکلے ہیں جن کے لیے وہ اپنی عزیز سے عزیز شے حتیٰ کہ زندگی کو بھی داؤ پر لگا سکتے ہیں۔

ایسا جہاد پیشہ ور سپاہی قطعی طور پر نہیں کر سکتے مگر ایسے رضا کاروں کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے جن کی تربیت ایک خاص نہج پر ہوئی ہو جو اپنے نصب العین اور عظیم

مقاصد کو معتبر سمجھتے ہوں' نظریات کو اپنے جذبات میں ڈھال لیں پھر ان کے حصول کے لیے اپنے آپ کو تج دیں اور یہی ان کی زندگی کا محبوب ترین مقصود بن جائے۔

واضح ہو کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تحریک کو تین مختلف سمتوں میں چلایا۔ ان کی اس حکمت عملی نے تاریخ پر ثابت کر دیا کہ انہوں نے اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیابی حاصل کی۔



سید احمد شہیدؒ

سید احمدؒ رائے بریلی کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا کنبہ اپنے تقدس اور بزرگی کے سبب معاشرے میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ ''شاہ علم اللہ'' کی خانقاہ ''تکیہ شاہ علم اللہ'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ جو کم و بیش عرصہ سو سال تک اودھ میں تشنگان علم کے لیے چشمہ بنی رہی۔

شاہ ولی اللہؒ نے اسی خانقاہ کو اودھ میں اپنے نظریات کی ترویج اور دینی تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا تھا اور شاہ ابوسعید (سید احمدؒ کے نانا) کو اس مرکز کا نگران مقرر کیا۔ ان کے روحانی فیوض جنوبی ہند میں میسور اور سرنگاپٹم تک پہنچے اور ان کی تعلیمات نے حیدر علی اور سلطان ابوالفتح علی المعروف سلطان ٹیپو کو متاثر کیا۔

سید احمدؒ جوان عمری میں اپنے گھر سے چلے۔ باپ کا سایہ سر سے پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ پہلے روزگار کی تلاش میں لکھنؤ پہنچے جہاں شاہ اودھ کے پردہ میں انگریزوں کا اقتدار ناچ رہا تھا۔ سید احمدؒ کی طبیعت لکھنؤ کی یہ حالت دیکھ کر چند یوم میں وہاں سے اُچاٹ ہو گئی اور وہ بددلی کی حالت میں ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر تن تنہا دہلی پہنچے۔

دہلی میں آپ شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائیوں کی محبت کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ بعد ازاں ساری عمر آپ نے اس خاندان کا در نہ چھوڑا۔ وہ باقاعدہ مولوی تو نہ بن سکے مگر آپ نے عام روحانی کمال مکمل طور پر حاصل کیے اور جب حالات نے تقاضا کیا کہ ہندوستان کا ہر شہری انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائے تو شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کی طبیعت کے پیش نظر آپ کو نواب امیر علی خان اور جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں

بھیج دیا۔ جسونت راؤ مرہٹہ سردار تھا جو اس وقت انگریز سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔

مہاراجہ ہلکر پے در پے ناکامیوں کے سبب اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔[1] اسے اندور کے چھوٹے سے علاقے کی جاگیر عطا کر دی گئی جبکہ امیر خان کو ٹونک اور اس کے ساتھی غفور خان کو سرونج کا علاقہ دے کر خاموش کر دیا گیا۔

سید احمدؒ نے امیر خان کے ہتھیار ڈالنے اور نوابی اختیار کرنے سے اختلاف کیا اور جب ان کی رائے تسلیم نہ کی گئی اور امیر علی خان کا رجحان انگریزوں سے صلح کی طرف بڑھتا گیا تب آپ نے اسے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا اور ۱۸۱۶ء میں صلح کا معاہدہ ہونے سے پہلے دہلی پہنچ گئے۔[2]

انگریزوں کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا اور اس کی زمین پر چاند و سورج نے غروب ہونا ترک کر دیا تھا۔ ۱۸۱۸ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں برطانوی عفریت کے سامنے جھک چکی تھیں۔ انگریزی اقتدار کا پرچم درہ خیبر سے لے کر راس کماری اور بمبئی سے آسام اور برما کے ساحل تک لہرانے لگا تھا۔

اس دور میں تمام گردنیں طاقت کے سامنے جھک چکی تھیں، شاہ عبدالعزیزؒ کی واحد جماعت ایسی تھی جس نے تن تنہا برطانوی امپریلزم سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ وہی جماعت تھی جس کی تربیت شاہ ولی اللہؒ کے مرتب کردہ اصولوں پر ہوئی تھی اور ہمہ گیر انقلاب ''فک کل نظام'' برپا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

مایوسیوں کے اس تاریک دور میں بوڑھے شاہ عبدالعزیزؒ نے بڑھاپے، بیماری اور بینائی جاتے رہنے کے باوجود پیچھے لوٹنے کے بجائے اپنا ایک قدم منزل کی جانب آگے بڑھایا۔ انقلاب کا جدید خطوط پر خاکہ تیار کیا اور اپنے شاگردوں اور مریدوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر انہیں ذمہ داریاں سونپ دیں۔

---

1. سیاسی تاریخ ہند: جلد اول باب ۷
2. سوانح احمد: صفحہ ۱۹

جانب انقلاب

شاہ عبدالعزیزؒ نے ہمہ گیر انقلاب ''فک کل نظام'' برپا کرنے کیلئے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے یا گروپ کا نگران و امیر سید احمدؒ کو مقرر کیا اور ان کی مدد کے لیے مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل کو بطور مشیر مقرر کیا۔ ان کے ذمہ حسب ذیل کام سپرد کیا گیا:

۱۔ ملک بھر کے دورے کر کے ہندوستانی عوام میں انقلابی روح بیدار کرنا۔
۲۔ ملک بھر سے رضا کاروں کی بھرتی اور ان کی فوجی تربیت۔
۳۔ مالیہ کی فراہمی
۴۔ دیگر ممالک سے تعلقات
۵۔ فوجی کارروائی (باضابطہ جنگ)

دوسرے گروپ کی قیادت شاہ عبدالعزیزؒ نے خود اپنے ہاتھوں میں رکھی اور سن رسیدہ مریدوں اور شاگردوں کو اس کا رکن بنایا۔ انہوں نے اپنے ذمہ جو کام لیے ان کی تفصیل یہ ہے:

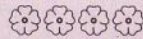
۱۔ مرکز کو سنبھالنا۔
۲۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ جو شاہ ولی اللہؒ کے زمانے سے جاری تھا اور ''ہمہ گیر انقلاب'' کے برپا کرنے کے لیے جس کام کا جاری و ساری رہنا از حد ضروری تھا، اسے بہر طور قائم رکھنا۔
۳۔ پہلے گروپ کے محاذ پر جانے کے بعد ملک کی فضا کو انقلاب کے لیے سازگار

بنانا۔

۴۔ نئے رضا کاروں کی بھرتی اور مالیہ کی فراہمی کے تمام کام اس گروپ کے ذمہ تھے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی مدد کے لیے دوسرے گروپ میں جن لوگوں کا انتخاب کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی
۲۔ مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی
۳۔ مفتی رشید الدین دہلوی
۴۔ مفتی صدر الدین دہلوی
۵۔ مولانا حسن علی لکھنوی
۶۔ مولانا حسین احمد، ملیح آبادی
۷۔ مولانا عبدالغنی دہلوی



سید احمد شہیدؒ کا لانگ مارچ

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کے نتیجہ میں ہندوستانی عوام کے خوابیدہ جذبات اور جذبہ حریت بیدار ہونا شروع ہوا تو بے رحم برطانوی اقتدار کی فوجی قوت نے ان کو اور شدت سے دبانا شروع کر دیا۔ تاریخ گواہ ہے جب بھی مظلوم کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ مرنے مارنے پر اتر آیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی تربیت کے اثرات نے رنگ جمانا شروع کیا اور ہمہ گیر انقلاب کے بیج جو لوگوں کے دل و دماغ میں بو دیئے گئے تھے ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب عوام کو سید احمدؒ شہید کے زیر اہتمام تشکیل پانے والی پارٹی کا علم ہوا تو جگہ جگہ سے دعوت نامے پہنچنے لگے۔

چنانچہ سید احمدؒ نے ملک گیر دوروں کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔ اس پروگرام کے تحت سید احمد شہیدؒ کی جماعت نے سات سال کے عرصہ میں ملک اور بیرون ملک کے تین اہم دورے کیے۔

سید احمد شہید جس انقلابی پروگرام کو لے کر چلے تھے، اس کی تکمیل کیلئے آپ نے جو قربانیاں دیں اور مجاہدے کیے، ان کے سبب اپنے ساتھیوں میں آپ کو شیخ کا بلند مقام حاصل ہوا۔ آپ کے روحانی کمالات اور اخلاقی خوبیوں نے بڑے بڑے اہل علم حضرات کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ حتیٰ کہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر بھی کہنے پر مجبور ہو گیا:

''ان کے مرید ان کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے اور صاحب جاہ علماء (مولانا عبدالحی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی) عام خدمت گاروں کی طرح ان کی پالکی کے

ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔''[۱]

مارکوئس ہیسٹنگز کی سخت گیر پالیسی دیسی حکومتوں کے تخت الٹ رہی تھی اور حریت پسندوں کے گرد سامراج اپنا حصار تنگ کر رہا تھا۔ دوسری طرف آزادی کے صرف ۵۰ پروانوں نے ۱۸۱۸ء میں اپنا عظیم انقلابی سفر دہلی سے شروع کیا۔

سید احمد شہیدؒ نے اپنے مختصر انقلابی لشکر کے ہمراہ دہلی کے شمال میں سفر کا آغاز کیا' رخصت کے وقت شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک دستار سیاہ اور ایک پیراہن سفید' سید احمد شہیدؒ کو اپنے ہاتھوں سے پہنا کر سفر کی رخصت مرحمت فرمائی۔[۲]

آپ نے دہلی سے شمال کی جانب کوچ کیا' غازی الدین نگر' مرادنگر' میرٹھ سردھنہ' بڑھانہ' پھلت' مظفر نگر' دیوبند' سہارن پور سے ہوتے ہوئے یہ قافلہ گڈھ میکسٹر پہنچا۔ وہاں سے یہ قافلہ رام پور' بریلی' شاہ جہاں پور پہنچا۔

اس سفر میں تقریباً چار ماہ صرف ہوئے۔ دوران سفر آپ کو اپنے برادر حقیقی سید اسحاق کی وفات کی خبر ملی اور مجبوراً آپ کو وطن جانا پڑا۔ اس دوران آپ کے قافلہ میں مزید تیس افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔

آپ نے رائے بریلی میں اپنی خاندانی خانقاہ ''تکیہ شاہ علم اللہ'' میں قیام کے دوران اپنے نئے ساتھیوں کی تربیت کی۔ اس دوران ایسے لوگ بھی اس انقلابی قافلے میں آملے جو اس قافلے سے متاثر ہو چکے تھے۔ رائے بریلی میں چند ماہ قیام کے دوران اس عجیب وغریب قافلے کا چرچا دور دور تک ہو گیا۔ نیز اب آپ کے رفقاء کی تعداد اسی (۸۰) سے ایک سو ستر (۱۷۰) تک جا پہنچی۔

رائے بریلی میں چند ماہ قیام کے بعد سید احمد شہیدؒ کا تاریخ میں اپنی نوع کا واحد قافلہ الہ آباد کیلئے روانہ ہوا۔ الہ آباد سے کانپور اور کانپور سے منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے یہ قافلہ بنارس' سلطان پور' سلطان پور سے دوبارہ رائے بریلی پہنچا۔ تقریباً

۱ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲

۲ سوانح احمدی صفحہ ۲۵

دو ہفتوں کے مختصر قیام کے بعد رائے بریلی سے آپ صوبہ اودھ کے دار السلطنت لکھنؤ تشریف لے گئے۔

سفر کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی ایسا شخص قافلے میں شریک نہ کیا جائے جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ جب پارٹی کے پاس کوئی رقم نہ ہوتی تو یہ اصول فاقہ کشی کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس طرح یہ خدائی فوج بھوک و پیاس کی سختیاں جھیلنے کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ کئی کئی وقت کا فاقہ بھی اس کی بشاشت اور زندہ دلی میں فرق پیدا نہ کر سکا۔

رائے بریلی سے الہ آباد کے سفر کے دوران ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں بڑی مشکل سے کھچڑی پکانے کا بندوبست کیا گیا' رکابیاں اور پلیٹیں نہ ہونے کے سبب ایک کنوئیں کی پختہ زمین کو دھو کر صاف کیا گیا' اس پر کھچڑی ڈال دی گئی اور درویشان خدا خوشی خوشی کھا کر ذکر وفکر میں مشغول ہو گئے۔[۳]

بنارس میں تیموری شہزادے بیعت ہوئے تو انہوں نے بیش قیمت کپڑے نذر کئے۔ آپ نے خزانچی مولانا محمد یوسف کو حکم دیا کہ ان کو فروخت کر کے گاڑھے اور گزی کے تھان خرید و اور تمام ساتھیوں میں تقسیم کر دو تاکہ وہ ضرورت کے مطابق کپڑے بنوا لیں۔[۴]

مصنف وقائع احمد کا بیان ہے کہ:

''آپ (سید احمد شہیدؒ) کو سب سے زیادہ خیال جہاد کا رہتا تھا۔ جس کسی کو مضبوط وتوانا دیکھتے تو فرماتے یہ ہمارے کام کا ہے۔ (ضلع اناو) کے شمشیر خان' اللہ بخش' شیخ رمضان اور مہربان خان ملاقات کو آئے۔ چاروں بڑے ڈیل ڈول کے نوجوان تھے۔ آپ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں' پیر زادے لوگ ہمارے کام کے نہیں ہیں

۳ سید احمد شہید: صفحہ ۱۵۶

۴ سید احمد شہید: صفحہ ۱۵۷

اور بہت تعریف کی۔ یہ نوجوان آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کے حلقہ میں داخل ہو گئے"۔[۵]

امان اللہ خان، سبحان خان، مرزا ہمایوں بیگ، غلام رسول خان، غلام حیدر خان اور صدر خان وغیرہ کا لکھنؤ میں ایک گینگ تھا جو چوری اور قذاقی میں کمال رکھتا تھا۔ قافلے کی شہرت سن کر ایک روز امان اللہ خان اور سبحان خان قافلے والوں کو دیکھنے آئے۔

وہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید صاحب کے نصیحت آمیز ارشادات نے پہلی ہی مجلس میں ان کی کایا بدل دی اور یہ اپنی تمام حرکتوں سے تائب ہو کر قافلے میں شریک ہو گئے۔[۶]

رفتہ رفتہ آپ کا کیمپ فوجی تربیت گاہ بنتا گیا اور جو وقت مراقبہ اور غور و فکر میں صرف ہوتا تھا، اب فنون حرب اور فوجی پریڈ میں استعمال ہونے لگا۔ بعض لوگوں کو یہ تبدیلی محسوس ہوئی تو وہ سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں پہنچے اور انہوں نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔

آپ نے فرمایا کہ سپاہیانہ کرتبوں کی مشقیں بظاہر مادی چیز ہے مگر اس کا مقصد نفع اندوزی یا ذاتی سربلندی نہیں بلکہ اس کا مقصد خدمت خلق، مظلوموں کی ہمدردی، اعلیٰ اور بلند مقاصد کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینا، تصوف، سلوک اور فقیرانہ زندگی کی اصل روح یہی ہے۔ جو تصوف اس روح سے محروم ہو وہ اکارت ہے۔ پس ان چیزوں میں مشغول رہنا، مادہ پرستی نہیں بلکہ حقیقی روحانیت اور اعلیٰ قسم کا تصوف ہے۔

آپ سفر کے دوران جہاں قیام کرتے وہاں تنظیم کا اس قدر خفیہ انتظام فرماتے کہ ذمہ دار لوگوں کے سوا کسی کو تنظیم کے بارے میں علم بھی نہ ہونے پاتا۔ تنظیم کے سلسلہ میں ہر جگہ جہاں آپ نے قیام فرمایا نقیب اور خلفاء مقرر فرمائے جو اپنی جگہ پر خود تحریک کے ذمہ دار تھے جن کے دم سے اس تحریک کی جڑیں تقریباً چالیس (۴۰) برس تک ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلتی رہیں۔ سفر کے دوران آپ درس و تدریس کا

[۵] وقائع احمدی، بحوالہ سیرت سید احمد شہید و علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد دوئم صفحہ ۱۰۲)

[۶] علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد دوئم صفحہ ۱۰۱)

انتظام بھی فرماتے اور لوگوں کی تربیت کا بندوبست بھی۔

لکھنؤ سے واپسی پر چند ماہ آپ نے رائے بریلی میں قیام فرمایا۔ پھر لانگ مارچ کے دوسرے اور تاریخی سات ہزار میل طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ نے اس مرتبہ رائے بریلی سے کلکتہ، کلکتہ سے مکہ معظمہ، پھر مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ سے ہوتے ہوئے آپ بمبئی پہنچے۔ بمبئی سے براستہ سمندر کلکتہ آئے، کلکتہ سے رائے بریلی پہنچ کر آپ کا دوسرا تاریخی دورہ ختم ہوا۔[۷]

سید احمد شہیدؒ نے جن حالات میں سفر حج کا اعلان کیا وہ فرضیت حج کیلئے ناکافی تھے یعنی ان حالات میں نہ سید صاحب پر حج فرض تھا نہ آپ کے ساتھیوں پر۔ البتہ فرضیت انقلاب کے لیے وہ حالات کافی اور واضح تھے کیونکہ اسلامی تعلیم ایسے حالات میں کہ جب وطن عزیز پر اجنبی طاقت کا تسلط ہو جائے، انقلاب کو فرض قرار دیتی ہے اور یہ فرض صرف اجتماعی نہیں رہتا بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک کا فرض ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اس کی آخری مقدور ہو، وہ انقلاب کے لیے اپنی جدوجہد صرف کر دے۔ اس موقع پر جو قربانی بھی پیش کی جاتی ہے وہ مستحق صد تحسین اور پسندیدہ ہوتی ہے۔

ایک مسلمان کیلئے قطعی طور پر یہ جائز نہیں کہ وہ بال بچوں کو بھوکا پیاسا چھوڑ کر بلا کسی ساز و سامان کے حج ادا کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہو۔ لیکن اگر وہ انقلابی مقصد کے لیے ایسا کر رہا تو اس کا ہر ایک اقدام مبارک اور اس کی ہر ادا۔ قربانی باعث اجر عظیم ہے۔ اب وہ گرد بھی مقدس ہے جو اس کے پیروں پر پڑتی ہے اور جس سے اس کے کپڑے میلے ہوتے ہیں۔

اگرچہ سید احمد شہیدؒ کے اس دورہ کا ظاہری مقصد حج بیت اللہ تھا مگر اس کے پس پشت محرکات وہی تھے جو پارٹی کا نصب العین تھا۔ وہ انقلابی مقصد تھا ہندوستان میں ہمہ گیر سیاسی، سماجی انقلاب برپا کرنا۔ آپ نے حج کے دوران "منیٰ" کے مقام پر جہاں تقریباً چودہ سو سال قبل داعی حق نبی، حق محمد ﷺ نے انصار سے بیعت لی تھی اپنے

[۷] علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد دوئم صفحہ ۱۰۳

ساتھیوں سے عقبہ کے مقام پر بیعت جہاد کی۔[8]

تحریک کا اہم مقصد سیاسی و سماجی انقلاب برپا کرنا تھا۔ نیز انقلاب کے بعد حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینا مقصود تھی جو فرسودہ نظام کی جگہ ترقی پذیر اور اصلاح یافتہ سماج کے معمار ثابت ہوں۔ آٹھ سو آدمیوں کے اس انقلابی قافلے کا مقصد محض سیاسی مظاہرہ نہ تھا بلکہ یہ درحقیقت اصلاح و تربیت کا انتہائی مؤثر اور کامیاب ذریعہ تھا۔

سید احمد شہید نے دوران سفر اپنے انقلابی ساتھیوں سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

''ہم صرف اللہ کے لیے محض اللہ کے بھروسے پر گھر سے نکلے ہیں' تقویٰ ہمارا خصوصی امتیاز ہونا چاہیے' ہمارا زادِ راہ توکل ہے۔ ہم کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ ضرورت پڑی تو ہم مزدوری کریں گے' آدھا کھائیں گے اور آدھا جماعتی ضرورتوں کے لیے محفوظ کریں گے''۔[9]

دوران سفر جب انقلابیوں کا قافلہ مرزا پور پہنچا تو اس نے دیکھا ایک کشتی لنگر انداز ہے اس پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی ہیں۔ مالک ان کو اتارنا چاہتا ہے مگر مزدور نہیں مل رہے۔

قافلہ کے ساتھیوں کو مالک کی پریشانی کا احساس ہوا تو وہ کشتی کی طرف بڑھے اور انہوں نے روئی کی تمام گانٹھیں اتار کر گودام تک پہنچا دیں۔ مالک بھی حیران تھا' شہر والے بھی تعجب کر رہے تھے کہ فرشتے کہاں سے آ گئے کہ پہلے سے کوئی جان پہچان بھی نہیں۔ شریف صورت' اجلی پوشاک اور مزدوروں کا کام محض اللہ واسطے کر رہے ہیں۔ یہ تھا خدمت خلق کا جذبہ جس نے انہیں ممتاز کر دیا۔

اسی طرح مرزا پور میں اینٹیں پکانے والوں کے سات گھر تھے جو گدھے والوں

---

۸ سیرت، سید احمد شہید۔

۹ سیرت احمد شہید صفحہ ۱۸۳

کے نام سے مشہور تھے۔ شہر کے شرفاء انہیں ذلیل و کمین تصور کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا پینا باعث عار سمجھا جاتا تھا۔

سید احمد شہیدؒ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو آپ نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ شہر کے لوگوں کو حیرانی ہوئی مگر وعدہ کے مطابق آپ نہ صرف وہاں پہنچے بلکہ دعوت تناول فرمائی۔ ان کا ہدیہ قبول کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ آپ ہدیہ کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔[10] آپ نے اس خاندان کی دعوت محض اس لیے قبول فرمائی کہ آپ اسلامی اصول مساوات قائم کرنا چاہتے تھے۔

سید احمد شہیدؒ نے ساتھیوں کی تربیت مکمل کرنے اور فوجی طاقت فراہم ہونے پر ۱۸۲۶ء میں اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہا اور آزاد قبائل کا قصد کیا۔ پنجاب کے راستے سے گزرنا مشکل تھا چنانچہ آپ راجھستان ہوتے ہوئے سندھ پہنچے جہاں حیدر آباد کے مقام پر امیران سندھ کی جانب سے سید صبغۃ اللہ ولایتی نے آپ کا استقبال کیا۔

دو جمعے حیدر آباد میں گزارے' حکام سندھ کی درخواست پر جمعہ کی نمازیں قلعہ میں ادا کیں۔ سردیوں کے موسم کے پیش نظر آپ نے یہاں قیام مختصر کیا۔ اس موقع پر آپ کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ نقد' ایک صندوق اور طمنچوں کی ایک جوڑی نذر پیش کی گئی۔[11]

حیدر آباد سندھ سے آپ پیر کوٹ (حال پیر جو گوٹھ) شکار پور پہنچے۔ یہاں سید احمد شہیدؒ نے انقلابی نمازیوں کو گاڑھے کے کپڑے بنوا کر دیے۔ شکار پور سے جاگن' خان گڑھ اور بھاگ ہوتے ہوئے آپ ڈھاور پہنچے' جہاں سے درہ بولان شروع ہوتا ہے۔

درہ کی کٹھن اور دشوار گزار منزلیں طے کر کے آپ کا قافلہ کوئٹہ پہنچا۔ کوئٹہ کے حاکم نے آپ کی دعوت کی' بیعت کی اور ساتھ چلنے کو تیار ہوا مگر آپ نے مصلحتاً منع فرما

---

۱۰ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد دوئم صفحہ ۱۵۸

۱۱ سید احمد شہید صفحہ ۲۹۷

دیا۔

کوئٹہ سے قندھار' غزنی اور کابل سے ہوتے ہوئے غازیوں کا یہ قافلہ پشاور پہنچا۔ یہاں تین یوم کے قیام کے بعد آپ "چارسدہ" پہنچے جہاں ایک آزاد ریاست کے قیام اور "فک کل نظام" کا انقلاب برپا کرنے کے لیے آپ نے قیام فرمایا۔ جس مقصد کے لیے دس ماہ قبل آپ نے وطن عزیز کو خیر باد کہا تھا' اس وادی پرخار میں قدم رکھا۔

بہار اور بنگال کے رہنے والے مجاہدین کے لیے یہ علاقہ اجنبی بھی تھا اور غیر محفوظ بھی لہٰذا اس قسم کے انتظامات بھی کر دیئے گئے کہ قافلے کے لوگ محفوظ رہ کر آسانی سے اگلی منزل تک پہنچ سکیں۔



انقلابیوں کی عارضی حکومت

آزادی کے متوالوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے پہلے مرحلے میں سات ہزار میل کا کٹھن اور پرخطر لانگ مارچ تقریباً سات ماہ میں مکمل کیا۔ قافلے نے جیسے ہی آزاد علاقے میں پڑاؤ ڈالا' سکھوں کی فوجوں سے ان کا تصادم شروع ہو گیا۔

ان حالات میں سید احمد شہیدؒ نے نظم و ضبط اور مفتوحہ علاقوں کا باقاعدہ نظام حکومت قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو انقلابیوں کی عارضی حکومت قائم کر دی گئی۔

عدل و انصاف' سول اور فوج کے باقاعدہ محکمے قائم کئے گئے۔ نیز اصلاح و اخلاق کے لیے محکمہ احتساب بھی ترتیب دیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کی تحریک کے پیروکار اور لانگ مارچ کے قائد سید احمد شہیدؒ اس "آزاد عارضی حکومت" کے پہلے امیر قرار دیئے گئے۔

اس موقع پر ساتھیوں نے باقاعدہ حلف وفاداری (بیعت) اٹھایا۔ بیعت ہونے والوں میں قافلے کے ساتھیوں کے علاوہ علاقے کے پٹھان بھی شامل تھے جنہوں نے وفاداری کا عہد و پیمان کیا۔[1]

آزاد حکومت کے قیام کے فوری بعد سید احمد شہیدؒ نے حکومت کے سفیر اور آرگنائزر ایران اور افغانستان کے مختلف قبائلی علاقوں کو روانہ کیے گئے۔ ہندوستان جو

---

1. تحریک شیخ الہند صفحہ ۸۹' علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوئم صفحہ ۱۹۰

آزاد حکومت کی مالی اور فوجی امداد کا مرکز تھا وہاں آرگنائزروں کو بالخصوص بھیجا گیا۔

حیدر آباد دکن اور مدارس جہاں انقلابی مسلمان لانگ مارچ کے موقع پر نہیں پہنچ سکتے تھے، وہاں جماعت کے سرگرم مبلغ مولانا سید محمد علی رام پوری کو بطور سفیر روانہ کیا گیا۔ ان کی مدد کیلئے عنایت اللہ خان، عبداللہ اور مقیم خان کو مقرر کیا گیا۔ آپ لوگوں کی ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ غازیوں کو ہندوستان سے سرحد تک پہنچنے کیلئے مناسب راستے کا بندوبست کریں تاکہ انہیں کسی منزل پر رکاوٹ پیش نہ آئے۔[۲]

کچھ دنوں کے توقف کے بعد سید احمد شہید نے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو حیدر آباد اور مولانا سید محمد علی کو مدراس پہنچنے کا حکم دیا جہاں ان لوگوں کے تبلیغی اور اصلاحی کارناموں نے انقلاب برپا کیا۔ ان دونوں حضرات کے ساتھ دیگر آدمی بھی روانہ کئے گئے جبکہ مولانا سید اولاد حسن قنوجی اور سید حمید الدین کو یوپی کے مختلف علاقوں میں تبلیغ و تنظیم کیلئے بھیجا۔

میاں دین محمد اور میاں پیر محمد اور بعض دیگر اصحاب کے ذمے ہندوستان کے مختلف حصوں میں خطوط پہنچانا اور وہاں سے روپیہ جمع کر کے لانا تھا۔

اس دوران شاہ اسحاق، جانشین شاہ عبدالعزیز کی سرپرستی میں دہلی کے مرکز سے انقلابیوں کی اس پہلی آزاد حکومت کے لیے ہر قسم کی امداد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

آزاد حکومت کی مقبولیت اور عوام کی حکومت سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آزاد حکومت کے قیام کے چند ہفتوں اور جنگ سیدو کے موقع پر سید احمد شہیدؒ کے فدائین کی تعداد ایک لاکھ[۳] تک پہنچ چکی تھی جو آپ پر جان قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔



---

۲ سوانح احمدی

۳ سوانح احمدی وقائع وغیرہ

حکومت کا مقصد

سید احمد شہیدؒ نے ''فک کل نظام'' کے تحت ایک نیا انقلابی معاشرہ قائم کرنے کے لیے جن مصائب و مشکلات کا سامنا کیا وہ انہی کا کمال تھا۔ آزاد حکومت کی امارت قبول کرنے کے بعد آپ نے سلطان ہرات، والی کابل، شاہ بخارا، رئیس قلات، آزاد قبائل کے سرداروں، ہندوستان کے سرآوردہ عمائدین، علماء کرام، بعض فرماں رواؤں اور سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو جو سفارتی خطوط تحریر کیے ان میں آپ نے واضح طور پر تحریر کیا کہ ''خدا گواہ ہے ہمارا منشاء دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا۔ ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں۔ نہ بندگان خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی سے حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔ ہمارا منشاء وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس۔ اور یہ اس لیے کہ تقاضا مذہب میں ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ متصور ہے''۔[۱]

آپ کا بنیادی مقصد چونکہ ہندوستان کو برطانوی سامراج کے عفریت سے نجات دلانا اور انگریزی اقتدار و تسلط کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی مایوسی، پریشانی اور زبوں حالی کا شکار تھے، اس لیے انہوں نے اس جدوجہد میں ہندوؤں کو بھی حصہ لینے کی دعوت دی۔ آپ نے انہیں صاف طور پر بتانے کی کوشش کی کہ ان کا واحد مقصد غاصبوں کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد کس کی حکومت ہو گی اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے

---

۱ مکتوب سید احمد شہید بنام شاہ بخارا و مکتوب بنام سردار بدھ سنگھ جنرل افواج مہاراجہ رنجیت سنگھ۔

ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔

اس ضمن میں سید احمد شہیدؒ نے سرحد سے گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کے وزیر اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو جو خط تحریر کیا اس میں بھی آپ نے واضح طور پر تحریر کر دیا' ''جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں' دنیا جہاں کے بادشاہ بن گئے اور سودا بیچنے والے دکاندار (انگریز) بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بلند مرتبہ رؤسا کی ریاست کو برباد کر دیا ہے اور ان کی عزت اور ان کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے۔

چونکہ وہ لوگ جو ریاست و سیاست کے مالک تھے گوشہ گمنامی میں بیٹھ گئے تھے۔ ناچار چند بے سروسامان فقیر کمر ہمت کس کھڑے ہو گئے ہیں۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لئے کھڑی ہو گئی ہے۔ یہ لوگ جاہ طلب' دنیا دار نہیں ہیں بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لئے اٹھے ہیں۔ انہیں مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔

جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انہی کی شوکت و عظمت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی۔ ہم کمزوروں کو بڑے بڑے رؤسا اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہل اسلام کو ان کا دلی تعاون حاصل رہے اور مسند حکومت ان کو مبارک ہو''۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدیدار غلام حیدر خان کو خط تحریر کرتے ہوئے سید احمد شہیدؒ فرماتے ہیں کہ ''اس صورت میں مناسب وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ سردار والا قدر راجہ ہندو رائے کو یہ بات سمجھائیں کہ ہندوستان کا بہت بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہر جگہ ظلم و جبر کی بنیاد قائم کر دی ہے۔ رؤسا

ہند کی ریاست برباد ہو گئی ہے۔ کوئی شخص مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا بلکہ ہر شخص ان کو اپنا آقا تصور کرتا ہے۔

چونکہ بڑے بڑے صاحب ریاست ان کے مقابلے کا خیال ترک کر بیٹھ گئے ہیں۔ ناچار چند کمزور ناچیز کمر ہمت کس کر کھڑے ہوئے ہیں۔ پس اس صورت میں رؤسا فی الحال ان کمزور خداکاروں کی امداد میں پوری پوری کوشش کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں''۔[۲]

یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اگر انقلابیوں کی اس عارضی حکومت کو جو بدقسمتی سے حقیقی حکومت کا روپ نہ دھار سکی' کامیابی سے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو یقیناً وہ حکومت شاہ ولی اللہؒ مجدد دہلوی کے تصور کے عین مطابق ہوتی۔

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مشہور کتاب ''البدور البازغۃ'' میں ترقی پذیر متمدن حکومت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا تجزیہ کر کے انہیں پانچ شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر وہ (شاہ ولی اللہؒ) رنگ و نسل' خاندان اور فرقہ کے امتیاز سے بالاتر ایسے ماہرین کی تلاش کرتے ہیں جو صلاحیت اور قابلیت کے اعتبار سے ہر ایک شعبہ کے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار بن سکیں۔

سربراہ حکومت کے لیے وہ ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جس میں ان تمام شعبوں (PORTFOLIOS) کی نگرانی کی مکمل صلاحیت ہو۔ ایسے جامع الصفات شخص کو انہوں نے ''الامام الحق'' کا نام دیا ہے۔ ایسے کامل رہنما کی متبادل صورت پیش کرتے ہوئے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ''چند ارباب دانش' صاحب تجربہ' ماہرین اور یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر عوام کی مقبول اور منتخب جماعت (پارلیمنٹ اور کابینہ) حکومت کی ذمہ دار ہو گی''۔[۳]



[۲] مجموعہ خطوط قلمی صفحہ ۱۴ بحوالہ کتاب مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا (صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۶)

[۳] البدور البازغۃ۔

قرآن

چاہتا ہے کہ

☆ اس پر ایمان لایا جائے ☆ اسے پڑھا جائے

☆ اسے سمجھا جائے ☆ اس پر عمل کیا جائے

اور

☆ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے

آپ کا فرض ہے کہ حسب استعداد ان حقوق کی ادائیگی کا بندوبست کیجئے

انقلابی فوج کا کردار

انقلابی فوج کے فدائین جو اپنا دھن' دولت اور جائیداد سب کچھ قربان کر کے سید احمد شہیدؒ کے لانگ مارچ میں شامل ہوئے تھے' حق اور اعلاء کلمۃ الحق کے مقابلہ میں وہ اپنی تمام تمنائیں' آرزوئیں جذبات اور مفادات بھی ترک کر چکے تھے۔

ان مجاہدین میں یہ روح کس طرح کارفرما تھی' اس بات کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ "'اکوڑہ' پر شب خون کیلئے مجاہدین کی فہرست تیار کی جا رہی تھی۔ عبد الحمید خان آفریدی ساکن جہان آباد ضلع رائے بریلی اس لیے فہرست میں شامل نہیں کیے گئے کہ بخار میں مبتلا تھے۔

عبدالمجید خان کو خبر ملی تو بے تاب ہو کر سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گریہ زاری کے ساتھ عرض کرنے لگے' حضرت! میں ایسا بیمار تو نہیں ہوں کہ چل نہ سکوں۔ یہ اللہ کے نام پر پہلا معرکہ ہے کیا میں اس میں سبقت کی فضیلت سے محروم رہ جاؤں گا؟

سید صاحب نے جذبہ ایثار کی یہ بے تابی دیکھی تو فہرست میں نام شامل کر دیا اور فرمایا' اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ اسی شب خون میں یہ شہید بھی ہو گئے لیکن اس طرح کہ چودہ (۱۴) سپاہیوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ نرغہ میں گھر کر زخموں سے چور ہوئے اور جام شہادت سے شوق و ذوق کی تشنہ لبی سیراب کی"۔ [1]

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۳۵۱' ۳۵۷

دیوبند کے مجاہدین میں شیخ بلند بخت اور ان کے بھائی محمد علی بھی تھے۔ ایک معرکے میں محمد علی شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا "الحمد اللہ جو مراد لے کر آئے تھے وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے"۔ [۲]

سید احمد شہید کی فوج کا ایک فدائی دوران جنگ زخمی ہو کر گرا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا فزت رب الکعبہ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

جنگ شیدو میں شکست کے بعد منتشر شدہ انقلابی چنگلئی کے مقام' جہاں سید احمد شہید کو بے ہوشی کے عالم میں پہنچا دیا گیا تھا' جمع ہوئے تو آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مجاہد بیمار پڑ گئے اور روزانہ ایک ایک دو' دو وفات پانے لگے۔ دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی۔ سینکڑوں مجاہدین میں سے صرف چھ سات تندرست تھے۔ وہ دن رات بیماروں کی تیمارداری میں مصروف رہتے تھے۔

سید رستم علی جل گانوی' اکوڑے میں زخمی ہوئے' دو ڈھائی مہینے نوشہرہ میں صاحب فراش رہے۔ چنگلئی پہنچنے پر ان کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی کہ تنہا چالیس بیماروں کا بوجھ اٹھا لیا اور اس خوبی سے ان کی خدمت کی کہ کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی۔

عسرت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کو روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی۔ تندرست غازی اسے پیس کر روٹیاں کھاتے اور بیماروں کے لیے اُبال کر دلیہ بنا دیتے لیکن عسرت اسی پر ختم نہ ہوئی۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ مٹھی بھر جوار بھی میسر نہ آ سکی تو یہ انقلابی مسلمان باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں یا پتے تلاش کرتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوں اور پانی میں جوش دینے سے گل جائیں۔

انہی چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں اُبالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے اور بیماروں کو بھی کھلاتے۔ اس حالت میں جن کی وفات ہوئی' ان کے کفن کے لیے کپڑا میسر نہیں تھا۔ اگر ان کے پاس چادریں ہوتیں تو انہی کا کفن بنا دیا جاتا ورنہ جاجم کے

[۲] سید احمد شہید صفحہ ۱۷۱' بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۱۹۹

ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اسے کام میں لاتے۔ [۳]

عارضی حکومت کے جو محصولات مقرر کیے گئے تھے ان کے وصول کرنے والوں کا کردار یہ تھا کہ دورے پر نکلتے تو آبادی سے نصف میل پر ٹھہر جاتے اور گاؤں کے سرداروں کو باہر ہی بلا کر حالات پوچھ لیتے۔

سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ ایک سوار نے موضع ڈاگئی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی تو سالار عبدالمجید خان سخت ناراض ہوئے۔ گاؤں والوں نے کہا یہ معمولی بات ہے لیکن رسالدار نے اس سوار سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ضابطہ کی پابندی کیجئے ورنہ امیر المومنین کے پاس چلے جائیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ دو سواروں نے کسی سے شکر مانگی' اُس نے جواب دیا کہ شکر تو نہیں گڑ موجود ہے۔ سوار غصہ میں آ گئے۔ رسالدار کو اس واقعے کا علم ہوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔ [۴]

فوجیں جب مارچ کرتیں تو راستہ کے آس پاس کے کھیتوں کو تباہ کر دینا عام بات تھی۔ دیہات سے جو چاہتے لوٹ لیا کرتے تھے مگر سید احمد شہیدؒ کے انقلابی لشکر نے پشاور پر حملہ کے وقت لمبا راستہ طے کیا تو احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لوگ پکار اٹھے کہ "یہ عجیب لشکر ہے کہ اگرچہ چھ سات ہزار سوار و پیادے اترے ہوئے ہیں مگر کسی پر ظلم نہیں کرتے"۔ [۵]

میئی میں جب انقلابی مجاہدین کو قاتلانہ حملے کا نشانہ بننا پڑا تو ان میں بنیر کا ایک نوجوان بھی تھا۔ بلوائی بار بار اسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہماری قوم کے ہو' ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے۔ تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔

[۳] سید احمد شہید صفحہ ۴۱۰' ۴۱۱ [۴] جماعت المجاہدین صفحہ ۴۲
[۵] سید احمد شہید صفحہ ۸۸

جنگ سیدو کے موقع پر انقلابی مسلمانوں کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ کو زہر دینے کا واقعہ مذہبی' سیاسی' اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے افسوس ناک' شرمناک اور سنگین تھا۔

زہر دینے والے سازشیوں کو جو سزا بھی دی جاتی کم تھی لیکن سید احمد شہید کا عفو و اغماض اور شان درگزر سب سے بالا تھی۔ چنانچہ نذر محمد اور ولی محمد جو یار محمد خان کے خانساماں تھے اور کھانا لانے پر مامور تھے کو جب مجاہدین نے گرفتار کر کے انہیں سزا دینا چاہی تو انہیں معاف کر دیا گیا۔

وہ وطن جا رہے تھے۔ راستہ میں پٹھانوں نے دوبارہ انہیں گرفتار کر لیا اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک جھونپڑے میں ڈال دیا تاکہ ان کا سردار آ جائے تو وہ ان کا سر قلم کر کے دل ٹھنڈا کریں۔

اتفاقاً سید احمد شہیدؒ کا گزر اس طرف ہوا تو انہیں بھی خبر کر دی گئی۔ اس اثناء میں پٹھانوں کا سردار بھی پہنچ گیا۔ سید موصوف سے درخواست کی کہ وہ وہاں سے تشریف لے جائیں ہم ان کو سمجھیں گے۔ یہاں حکم دینے کا موقع نہ تھا آپ نے خوشامد کر کے انہیں خان کے پنجے سے چھڑوایا اور رات کے اندھیرے میں ان کو باہر بھجوا دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے ماحول میں دس بارہ برس رہنے کے بعد قافلہ کا ہر ایک مجاہد اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مثال بن گیا تھا۔ نواب وزیر الدولہ المطران رقمطراز ہیں' "خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار لشکر کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کے اخلاص اور للّٰہیت کی تعریف کی جائے تو انہیں پورا کرنے کے لیے لمبا چوڑا دفتر درکار ہو گا"۔[6]

اس لشکر کے بچے کھچے افراد سرحد سے واپسی پر جہاں کہیں پہنچے وہاں کے معاشرے میں انہوں نے انقلاب پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت کے بے پناہ پراپگنڈہ کے باوجود اس تحریک کے تیس سال بعد ۱۸۵۷ء کا جہاد حریت برپا ہوا تو اس کے ماننے والوں کے دم خم وہی تھے۔

---

۶ جماعت مجاہدین صفحہ ۷۱

انقلابی حکومت کے مخالفین

سید احمد شہیدؒ کی انقلابی فوج اور حکومت کا اصل مقابل برطانوی سامراج تھا' جسے ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لیے انہوں نے اپنا من' دھن' تن سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ چنانچہ سامراج اور اس کی معاون قوتیں' ان کی انقلابی جدوجہد کی راہ روکنے کے لیے اپنی پوری قوت و جبر کے ساتھ میدان میں نکل آئیں۔ یہ قوتیں درج ذیل تھیں۔

۱۔ سکھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تمام فاتحانہ اولوالعزمیاں انگریزوں سے ہٹ کر پٹھانوں اور انقلابی فوج پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ ۱۸۲۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کرنے کے بعد یار محمد خان کو وہاں کا باج گزار حاکم مقرر کر دیا تھا۔[1] یوسف زئی کا علاقہ جہاں سید احمد شہیدؒ نے اپنی انقلابی حکومت بنائی تھی' آزاد تھا مگر پشاور کی فتح کے بعد مہاراجہ کی نظریں اسی علاقے پر لگی ہوئی تھیں۔

انقلابی مسلمانوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ایک نظریاتی تصادم اس وقت سے چلا آ رہا تھا جب مہاراجہ جسونت سنگھ راؤ ہلکر اور امیر علی خان انگریزوں سے لڑتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرداروں سے امداد حاصل کرنے امرتسر پہنچے تھے اور نہ صرف ناکام واپس ہوئے تھے[2] بلکہ "لیبل گرفن" کی روایت اگر درست ہے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ ہلکر کو امرتسر سے تیس (۳۰) کوس

---

۱ مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر ستیا رام کوہلی ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور صفحہ ۲۰۴

۲ ایضاً صفحہ ۹۸ تا ۱۰۰ و سیاسی تاریخ ہند از میجر جنرل سر جان میلکم لارڈ کارنوالس کا دور حکومت

پرے ہٹا دیں گے اور آئندہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔[۳]

سید احمد شہیدؒ کی دوربین نگاہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے مقابلہ میں پورے ایشیا کے اتحاد پر تھیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ وحدت ہند تو درکنار سکھوں کے متحدہ حکومت کے نظریہ سے بھی دستبردار ہو کر ستلج پار کے علاقے (جس میں پٹیالہ، نابھہ، جیند اور کپورتھلہ وغیرہ کی ریاستیں تھیں) پر انگریزی بالادستی تسلیم کر چکا تھا۔

اگر میجر باسو کا یہ الزام صحیح ہے کہ "انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تا کہ وہ سندھیا کا مقابلہ کر سکیں، اس لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے ملا رہا اور ان کا شکر گزار رہا"۔ تو سید احمد شہیدؒ اور رنجیت سنگھ کے درمیان وہی نظریاتی تصادم تھا جو مہاراجہ سندھیا اور انگریزوں کے درمیان تھا اور گمان اغلب کی یہی وجہ تھی سید احمد شہیدؒ نے مہاراجہ دولت راؤ کو خاص طور پر مسلمانوں کی انقلابی تحریک کی امداد کیلئے متوجہ کیا تھا۔

۲۔ شاہ پرست مسلمان

سید احمد شہیدؒ اور انقلابی مسلمان جو شاہ ولی اللہؒ کے مصلحانہ نظریات اور ہمہ گیر سیاسی اور سماجی نظریات کے لیے نبرد آزما تھے، ملوکیت اور بادشاہیت کے بدترین مخالف تھے جبکہ یار محمد خان جیسے خوانین شاہ پرست مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ اس وجہ سے یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یار محمد خان اختلاف مذہب کے باوجود سید احمد شہیدؒ کے مقابلہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیادہ قریب تھا۔

چنانچہ جنگ سیدو کے موقع پر جب مجاہدین کی طاقت نقطہ عروج پر تھی (سرداران پشاور، سرداران سمہ اور انقلابی مسلمانوں کو ملا کر تقریباً ایک لاکھ افراد کا لشکر سید احمد شہیدؒ کی زیر قیادت تھا) خوانین پشاور نے پہلے سید احمد شہیدؒ کو زہر دلوایا اور جب ان کی بے ہوشی کے باوجود جنگ نہ ٹلی اور مجاہدین کا پلہ میدان جنگ میں بھاری رہا تو سرداران پشاور اپنی فوج لے کر جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا سارا دباؤ مہاجرین پر آ پڑا اور ہزاروں مہاجرین شہید ہو گئے اس کے بعد بقول مصنف سید احمد شہید، "اب

---

۳ تاریخ راجگان پنجاب از لیپل گرفن

مسلمانوں کا مستقل طور پر دو طبقوں سے مقابلہ تھا۔ ایک سکھ اور دوسرے سرداران پشاور، خاوی خان[۴] کے تیور بھی اس گاؤں[۵] کے معاملہ کے بعد بدل گئے تھے اور وہ انتقام کا موقع ڈھونڈتا تھا۔ اب یہ سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے دشمن اور علانیہ حریف تھے۔"

انگریز سامراج

یہ انقلابی فوج کی بدقسمتی تھی کہ اسے بیک وقت ان دو دشمنوں کا جنگی محاذ پر مقابلہ کرنا پڑا۔ ان دو حریفوں کے علاوہ انقلابیوں کا تیسرا اور سب سے خطرناک دشمن انگریز تھا۔ اس نے سیاسی ڈپلومیسی سے توپ تفنگ استعمال کیے بغیر صرف لفظوں کے استعمال سے انقلابی مسلمانوں کا وہ نقصان پہنچایا جو سکھ اور شاہ پرست مسلمان نہ پہنچا سکے تھے۔

انگریزوں نے اپنا عظیم اصول "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" انقلابی مسلمانوں کے خلاف خوب استعمال کیا اور ایک شاطرانہ مثال قائم کی۔

جب تک سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف رنگروٹ بھرتی کے لیے اور سرمایہ فراہم کرنے تک محدود رہا، انگریز حکومت کے ذمہ داروں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ بعض انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ چنانچہ سید صاحب

---

۴ خاوی خان قلعہ ہنڈ کا سردار تھا، یہ قلعہ دریا "اباسین" کے پر فضا کنارہ پر بادشاہی شان و شوکت کی یادگار تھا۔ خاوی خان پہلے اتنا معتقد ہوا کہ سید احمد شہیدؒ اور آپ کے تمام رفقاء کو قلعہ ہنڈ میں لے گیا اور وہیں قیام پر اصرار کیا لیکن جب ایک موقع پر سید صاحب کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو وہ ان کے درپے آزار ہو گیا۔

۵ موضع مانبری کے گاؤں کے جھگڑے میں، جو مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے درمیان تھا، تقریباً ایک صدی سے جنگ چلی آ رہی تھی۔ بقول مصنف سوانح احمدی فریقین کے تین چار ہزار آدمی اس جھگڑے میں قتل ہو چکے تھے۔ جب اس علاقے میں سید احمد شہیدؒ کی حکومت کے احکامات نافذ ہوئے تو یہ معاملہ ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ تحقیق و تفتیش کے بعد سید صاحب نے مالکان اراضی کے دعویٰ کو جائز اور صحیح قرار دے دیا اور فریق ثانی سے جبراً تخلیہ (خالی) کرا دیا۔ خاوی خان فریق ثانی کا حامی تھا اس کو زک اٹھانی پڑی اور جیسا کہ خود نما اغراض پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس کو نہ صرف عدالت سے بلکہ سید احمد شہیدؒ کے پورے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔

کے قافلہ کی دعوت کرنے والوں میں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام ہیں وہاں ایک انگریز کا نام بھی ملتا ہے جس نے پورے قافلے کے لیے کشتیوں پر کھانا پہنچایا تھا۔

علاوہ ازیں کلکتہ میں مولانا محمد اسماعیل کے وعظ میں جہاں ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا وہاں انگریز اور ان کی بیگمات بھی ان اجتماعات میں شریک ہوا کرتی تھیں۔

جہاد پر جانے سے قبل سید احمد شہیدؒ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی تھی جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے فرمایا کہ جب تک انگریزی عمل داری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔ [۶]

ڈاکٹر ہنٹر اس ضمن میں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے صفحہ ۳۳ پر رقمطراز ہے'

''ایک انگریز تاجر نے جو شمال مغربی صوبہ میں تیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا' مجھے بتایا کہ اس کے بہت سے دین دار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معین حصہ ''ستیانہ کیمپ'' کے لیے علیحدہ کر دیا کرتے تھے اور جو ان سے زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لئے چلے جاتے تھے جس طرح کبھی کبھی اس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے۔

اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو تیل کی تجارتی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۶ء کے درمیان اس عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضے کی ادائیگی کے لیے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا تھا''۔

سر سید احمد خان جن کا نمایاں کارنامہ' مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں اور تلخیوں کو کم کرنا تھا۔ نیز جنہوں نے اس دور میں مسلمانوں کو انگریزوں

---

[۶] سوانح احمدی صفحہ ۸۹' حوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۲۱۳

کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی' اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں'

''اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔

گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنا چاہیے۔ دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی' جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔'' [۷]

ڈاکٹر ہنٹر کے خیال میں انگریزوں کی انقلابی مسلمانوں سے اس رویہ (چشم پوشی) کی وجہ ان کی لاپروائی' عدم واقفیت اور غفلت تھی کیونکہ مسلمانوں کی یہ تحریک انتہائی راز دارانہ تھی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی کیونکہ یہ لاتعلقی انگریز کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت برتی جا رہی تھی کیونکہ اس طرح'

۱۔ انگریزوں کا ایک مخالف عنصر (انقلابی مسلمان) مقبوضہ جات سے باہر جا رہے تھے۔

۲۔ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کے لیے جو خطہ زمین منتخب کیا تھا وہ بھی انگریزی عملداری سے باہر تھا۔

۳۔ انگریز کے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ حریت پسندوں کے اس لشکر میں میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ داخل کر کے مسلمانوں کی طاقت کو ان کے مرکز پر ہی مفلوج کر دیتے۔

۴۔ برطانوی سامراج کے لیے یہ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ زمان شاہ جیسے اور چند ''شاہ پرستوں'' کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں بغاوت کے جراثیم پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتا اور ان کی تحریک اندرونی بغاوت سے ختم کرا دی جاتی۔

---

[۷] انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ دسمبر ۱۸۷۱ء بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۱۲

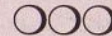
۵۔ انگریزی مقبوضات تک پہنچنے کے لیے انقلابی حریت پسندوں کی راہ میں سکھ حکومت حائل تھی اور انگریزوں کے لیے یہ کام انتہائی آسان تھا کہ جس طرح روہیلوں کو شجاع الدولہ کے ذریعے اور سلطان ابوالفتح علی المعروف سلطان ٹیپو کو نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کی امداد سے شکست دی گئی تھی' مسلمانوں کی اس طاقت کو بھی ختم کرا دیا جاتا۔

ان اسباب کی روشنی میں اسے انگریزوں کی غفلت اور لاپروائی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ ان کا تدبر تھا کہ اپنے مقبوضات میں انہوں نے سید احمد شہیدؒ کی اس تحریک پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اس طرح انہوں نے رواداری' انصاف پسندی اور فراخ حوصلگی کی نمائش کی اور کوئی غیر معمولی طاقت استعمال کیے بغیر دشمن کو ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی۔

چنانچہ اس حقیقت سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی سامراج نے وہابیت کا الزام تراش کر مسلمانوں کی اس جدوجہد کو اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ ایسا نقصان نہ سکھوں کی ٹڈی دل فوج پہنچا سکی اور نہ یار محمد خان کی مسلح طاقت۔

''وہابیت'' کے زہریلے پروپگینڈے سے خود مسلمانوں کے ہاتھوں انگریزوں نے سید احمد شہیدؒ کے لشکر کے ایک بڑے حصہ کو ایک رات میں ہی ذبح کرا ڈالا کیونکہ وہابیت کی حقیقت سے نہ مہاراجہ رنجیت سنگھ واقف تھا اور نہ یار محمد خان میں یہ شعور تھا۔

یہ شعور اور وہابیت سے نفرت انگیز اثرات سے صرف انگریز ہی آشنا تھا جن کے کچھ جہاز (تجارتی) ۱۸۰۹ء میں وہابیوں نے خلیج فارس سے گزرتے ہوئے لوٹ لیے تھے۔ پھر انگریزوں کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ وہابیوں کی طرف سے مشرق وسطیٰ' افریقہ اور ایران میں کتنی نفرت پھیلی ہوئی ہے۔



انقلابی مسلمانوں کی جنگیں

سید احمد شہیدؒ کی فوج کا پہلا حملہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء [1] کو ہوا۔ اس مقابلہ میں ۳۷ [2] مہاجر شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے۔ اس حملے کے نتیجہ میں مخالفین' مسلمانوں کی قوت' بہادری اور چابک دستی سے مرعوب ہو گئے اور قرب و جوار کے خوانین بھی متاثر ہوئے۔ اس واقعے کے بعد قلعہ ''ہنڈ'' کا رئیس ''خاوی خان'' بڑی عقیدت مندی سے حاضر ہوا' مجاہدین میں اپنا نام لکھوایا اور سید احمد شہیدؒ کے تمام رفقاء کو قلعہ میں لے گیا۔

اس کے بعد ہونے والی جھڑپوں میں اکثر و بیشتر کامیابی مہاجرین کو نصیب ہوتی رہی۔ اسی طرح علاقے کے پٹھان بھی آپؒ کے حلقے میں شامل ہوتے رہے حتیٰ کہ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو جب آپ نے اپنی باضابطہ امارت و حکومت کا اعلان کیا تو سوات' سمہ اور بنیر کے خوانین (بقول مولانا شاہ اسماعیل [3] فوج و لشکر اور توپ و شاہین کے مالک تھے) بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔

یار محمد خان جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا گورنر مقرر تھا' اس کے بھائی سلطان محمد خان اور پیر محمد خان نے بذریعہ خط سید احمد شہید کی امارت تسلیم کر لی تھی۔ [4]

سکھوں کی حکومت کی جانب سے سید احمد شہیدؒ کو پیش کش ہوئی کہ ''دریائے اباسین سے اس پار کا علاقہ مہاراجہ کی طرف سے انعام تصور کریں اور آئندہ اقدام کا

1۔ روشن مستقبل
2۔ سیرت احمد شہید۔
3۔ سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر
4۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوئم صفحہ ۲۱۶

قصد نہ کریں ۵۔ مگر آپ چونکہ ملک کے خواہاں تھے نہ حکومت و امارت کے متمنی بلکہ جن اعلیٰ مقاصد کے لیے آپ اور آپ کے ساتھیوں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں ان کے لیے ایسے انعامات توہین کے مترادف تھے' اس وجہ سے آپ نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مہاراجہ کی طرف سے باقاعدہ حملے کا بندوبست کیا گیا۔

سیدو کے مقام پر انقلابیوں کی سکھوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ سکھوں کا لشکر جرار پورے سازوسامان سے لیس وہاں پہنچا اور سید احمد شہیدؒ کا لشکر بھی میدان جنگ میں خیمہ زن ہو گیا۔ اس موقع پر آپؒ کے زیر حکم ایک لاکھ کا مجمع تھا مگر اس قدر بھاری جمعیت کھوکھلی تھی کیونکہ اس لشکر میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن کے غرور اور بلند مرتبہ کو سید احمد شہید کی حکومت کے محکمہ احتساب کی مساوات پسندی سے ٹھیس پہنچی تھی۔

خاوی خان جس نے بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا وہ بھی محکمہ عدلیہ کے شکنجہ میں کسا جا چکا تھا۔ موضع مانبری کے جھگڑے میں خاوی خان کے تہوک کے خلاف فریق ثانی کو ڈگری دی گئی تھی اور اس کا اجراء بھی کر دیا گیا تھا۔

سرداران پشاور بھی سید احمد شہیدؒ کے لشکر میں شامل تھے جو آپ کی امارت قبول کرنے کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر اثر تھے اور شاہ پرستانہ مزاج کے باعث ان کی ہمدردیاں رنجیت سنگھ کے لئے تھیں۔

اس اندرونی کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص اس شب جس صبح فیصلہ کن جنگ ہونے والی تھی' سید احمد شہید کو زہر دیا گیا' صبح مولانا اسماعیل آپ کے خیمہ میں گئے تو سید احمد شہید کی حالت غیر تھی۔ ان پر بے ہوشی کا غلبہ تھا اور قے جاری تھی۔

مولانا اسماعیل نے اس خبر کو کمال ہوشیاری سے چھپائے رکھا خود آپؒ نے بھی جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے مرض کو چھپایا اور اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔

میدان جنگ میں مجاہدین کا پلہ بھاری تھا۔ اس دوران سرداران پشاور اور سکھوں

۵ الدر المنثور۔ فی احوال صادق پور۔

کی فوج کے کمانڈر میں کچھ نامہ و پیام ہوا اور سرداران پشاور اپنی فوج اور سامان جنگ لے کر میدان جنگ سے نکل گئے۔

جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سرداران سمہ اور ان کی فوج بد دل ہو گئی اور اس طرح لڑائی کا سارا دباؤ ہندوستانی مہاجرین انقلابیوں پر آن پڑا۔ وہ پوری ہمت و جواں مردی سے لڑے مگر اس طرح سے گھر گئے کہ فتح کا امکان ختم ہو گیا۔

دریں اثناء دوسری سازش منکشف ہوئی کہ شاہ پرستوں (یار محمد خان) کا پیش کردہ ہاتھی جس پر سید احمد شہیدؒ سوار تھے' لنگڑا ہے۔ فوراً آپ کو گھوڑے پر سوار کرا دیا گیا اور مجاہدین کو گھیرے سے نکلنے کا حکم دیا گیا۔

سید احمد شہیدؒ کو ایک قریبی گاؤں میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک ہفتے کے آرام کے بعد آپؒ کو صحت نصیب ہوئی۔ اس جنگ میں اگرچہ مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ شاہ پرستوں کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو' ان کا محاذ ایک ہی ہے۔ یار محمد خان اور خاوی خان وہی کر سکتے ہیں جو شیر سنگھ اور بدھ سنگھ (سکھ کمانڈر) کے رجحانات ہیں۔

دوبارہ لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سرداران پشاور جنگ میں پیش پیش تھے اور سکھ سردار اور ان کی فوج سرداران پشاور کی پشت پر مگر ان متحدہ قوتوں کے مقابلہ میں بھی کامیابی و نصرت مجاہدین کے قدم چومتی رہی۔

انقلابی فوج نے ۱۱ اگست ۱۸۲۹ء کو قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا۔ خاوی خان مارا گیا اور قلعہ مجاہدین کے قبضہ میں آ گیا۔ خاوی خان کے بھائی امیر خان نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے یار محمد خان سے امداد چاہی۔ یار محمد خان نے امیر خان کی مدد کیلئے ہنڈ پر لشکر کشی کی۔ مجاہدین کے مقابلہ میں یار محمد خان قتل ہوا۔ اُس کی فوج نے راہ فرار اختیار کی۔ بعد ازاں میر خان کا بھی انتقال ہو گیا۔

انقلابی لشکر آگے بڑھا اور آواخر ستمبر ۱۸۲۹ء تک پشاور میں داخل ہو گیا۔ اہل شہر نے مجاہدین کا پرجوش استقبال کیا۔ دکانیں کھل گئیں۔ سید احمد شہیدؒ نے شہر میں امن کا

اعلان کرا دیا۔ جس سے شہری مطمئن ہو گئے۔ البتہ اب قحبہ خانے بند ہو گئے شراب کی بھٹیاں سرد پڑ گئیں اور بازاری عورتیں روپوش ہو گئیں۔

اعمال و اخلاق پر احتساب جاری کیا گیا اور مقدمات کے فیصلوں کیلئے عدالت قائم کر دی گئی۔ یار محمد خان کے بھائی سلطان محمد خان نے جب حالات کو تبدیل دیکھا تو وہ بااثر خوانین کی سفارش کے ساتھ طالب عفو تقصیر ہوا۔

سید احمد شہیدؒ کے چند ساتھیوں نے درخواست کی مخالفت کی مگر اس کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے حاکم مقرر کر دیا گیا جبکہ مولانا سید مظہر علی عظیم آبادی کو محکمہ انصاف کا جج مقرر کر دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد مجاہدین کے لشکر نے پشاور سے نکل کر پنجتار کیمپ میں پڑاؤ ڈالا۔

۱۔ پشاور کی فتح، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے ناقابل برداشت حادثہ تھی۔ ۲۔ انگریز ۱۷۹۹ء میں شاہ زمان کے عہد میں ایران اور کابل کی بساط سیاست میں دخیل ہو چکے تھے۔ لارڈ منٹو ۱۸۰۸ء کے زمانے میں انگریزی سفارت مسٹر الفنسٹن کی رہنمائی میں کابل سے باضابطہ تعلق پیدا کر چکی تھی۔

ان کے لیے بھی یہ حادثہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہ تھا کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اگر پڑوسی ہونے کے سبب انقلابی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھا تو انگریزوں کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ فاتح پشاور کے عقیدت مند پورے شمالی ہند اور بنگال میں موجود تھے۔ اگر شمال مغرب میں سید احمد شہیدؒ کی حکومت پشاور میں قائم ہو چکی تھی تو دوسری طرف شمال مشرق میں سید احمد شہیدؒ کے معتقد خاص نثار علی نے بنگال میں تحریک شروع کر کے ایک منظم بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔[۶]

سکھوں اور انگریزوں کے علاوہ سلطان محمد خان جسے حاکم پشاور بنا دیا گیا تھا۔ شاہ پرستی میں اپنے مقتول بھائی خادی خان سے کسی طرح پیچھے نہ تھا۔ اس نے سید احمد شہیدؒ سے خوشامد کر کے حکومت حاصل کر لی تھی۔ دوسری طرف اس نے رنجیت سنگھ سے

۶ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوئم صفحہ ۲۲۰

کامل وفاداری اور اطاعت ظاہر کرنے کے لیے لیلیٰ نام کی گھوڑی اور مروارید کی مالا اس کی نذر کی جو وفاداری اور خوشامد کی انتہا تھی۔

نفرت پھیلانے کیلئے

انگریزوں کی سرپرستی میں ان تمام سامراج دوست طاقتوں نے مجاہدین کے خلاف ''وہابی''[۸] کا لفظ استعمال کیا جس نے انقلابی مسلمانوں کے خلاف جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سرحدی پٹھانوں میں غیر اسلامی رسومات کے خلاف سید احمد شہیدؒ کی سرگرم اصلاحی جدوجہد اس الزام کی دلیل تھی۔ پھر ایک منظم سازش کے تحت تمام علاقے کو انقلابی مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔

مجاہدین کا قتل عام

سلطان محمد خان نے حالات سے مکمل فائدہ اٹھایا اور اپنے بھائی یار محمد خان کے قتل کے الزام میں قاضی مظہر علی (محکمہ انصاف کے جج) کو سر دربار قتل کر دیا۔ فیض اللہ خانی مہمند جن کی کوششوں سے سلطان محمد خان کو معافی اور پشاور کی حکومت ملی تھی نے جب قاضی صاحب کے قتل پر احتجاج کیا تو وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ دریں اثناء سید احمد شہیدؒ کی حکومت کے سینکڑوں کارکنوں کو جو عشر کی وصول کے لئے علاقہ سمہ میں متعین کیے گئے تھے[۷] ایک ہی شب ذبح کر ڈالا گیا۔ ان کارکنوں کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے۔

حالات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ پشاور اور سمہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی اور ملوکیت کے پرستاروں کا قلع قمع کر دیا جاتا مگر فرسودہ نظام کو تبدیل کرنے کا عہد کرنے والے عظیم انقلابی سید احمد شہیدؒ نے خانہ جنگی کو پسند نہ کیا۔ انہیں اپنے شہید ہونے والے

۷ سوانح احمدی

۸ شیخ عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں کو وہابی کہا جاتا تھا۔ اس گروہ کے لوگوں نے چونکہ مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف مدینہ منورہ میں گستاخیاں کیں تھیں اس لیے اسلامی ممالک میں وہابیوں کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

ساتھیوں سے زیادہ اپنے نصب العین سے محبت تھی؛ جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ بھلا وہ خانہ جنگی کو کیسے پسند کرتے؟

سید صاحب کا ارادہ سندھ کو مرکز بنانے کا تھا مگر آپ نے سندھ پر بالاکوٹ کو ترجیح دی اور فتح پشاور سے تقریباً سولہ ماہ بعد اور عارضی حکومت کے قیام کے چار سال اور چار ماہ بعد ۱۸۳۰ء میں آپ نے اس علاقے سے کوچ کیا۔

برف باری کا موسم ہونے کے سبب مجاہدین کی جماعت آگے بڑھنے سے قاصر رہی۔ ایک محفوظ میدان میں جھونپڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس میدان سے چند میل کے فاصلے پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ولی عہد شیر سنگھ کی فوجیں بھی پڑاؤ ڈالے ہوئی تھیں مگر سید احمد شہید کا لشکر ایسے محفوظ مقام پر تھا جہاں سکھ فوج کا پہنچنا محال تھا۔

مئی کے مہینے میں برف باری بند ہونے پر دونوں لشکروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ شیر سنگھ کو حملہ کرنے کیلئے راستہ نہ مل رہا تھا وہ واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ غداروں نے اسے ایک مخفی راستے کا پتہ بتا دیا۔ اس طرح ۷ مئی ۱۸۳۱ء شیر سنگھ سامراج کی فتح کا نشان بن گیا۔

دست بدست جنگ میں سید احمد شہیدؒ مولانا اسماعیل و دیگر سینکڑوں انقلابی مسلمان شہید ہوگئے؛ جو باقی بچے وہ شہیدوں کی تجہیز وتکفین سے بھی قاصر تھے۔ شیر سنگھ نے شہیدوں کا پورا احترام کیا۔ سید احمد شہیدؒ کی نعش کو قیمتی دوشالہ اوڑھایا گیا۔ سکھ فوج میں موجود مسلمانوں نے شہیدوں کا جنازہ پڑھا اور وہ پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیئے گئے۔ [۹]

سید احمد شہیدؒ مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی کی وفات کے بعد اس تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ بقول ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر ''یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہوگئی تھی۔ خود سید احمد شہیدؒ کی وفات کو بھی ان کے پر جوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدس ذریعہ بنا لیا تھا''۔ [۱۰]

۹ سوانح احمدی صفحہ ۱۷۹ سید احمد شہید از غلام رسول مہر

۱۰ ہندوستانی مسلمان: صفحہ ۳۴

انقلابیوں کا نیا مرکز

تحریک کے اس دردناک انجام کے بعد سید احمد شہیدؒ کے خاندان کے لوگ اور کچھ مجاہدین نواب وزیر الدولہ والی ریاست ٹونک کی دعوت پر ٹونک تشریف لے گئے جہاں انہوں نے اپنی بقایا زندگی عبادت میں گزار دی مگر باقی انقلابی مسلمان دوبارہ منظم ہوئے۔ نظم وضبط قائم کیا اور ''ستیانہ'' کے سرحدی علاقے کو انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔

اس موقع پر مجاہدین نے تحریک کی قیادت مولانا نصیر الدین کو سونپ دی۔ آپ سید احمد شہیدؒ کے بھانجے تھے۔ اس طرح اس تحریک کے مردہ جسم میں ایک مرتبہ پھر روح پھونک دی گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تو اس واقعے کے چند سال بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور سید احمد شہید کے پیروکار برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر وبال جان بنے رہے۔

نئی راہیں

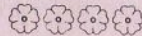
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی کوششوں اور مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں متعارف ہونے والے سید احمد شہیدؒ مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی جیسے حریت پسندوں نے برطانوی ہند میں ایک عظیم مقصد کے حصول کیلئے لانگ مارچ کے ذریعے ہندوستان اور بالخصوص شمال ہند میں انقلاب کے جو شعلے بھڑکائے تھے وہ خون شہادت کے چھینٹوں سے سرد ہونے والے نہ تھے۔

بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہونے والے شہدا کا لہو ابھی خشک بھی نہ ہوا تھا کہ سرفروشان اسلام کا ایک گروہ "سندھیاڑ" میں جمع ہو گیا۔ اس نے مولانا نصیر الدین کو اپنا امیر منتخب کر کے سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ سربلند کر دیا۔[1]

سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہو گئے۔ دہلی کے پرانے مرکز نے انقلاب کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ہندو مسلم اشتراک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی اور بعد ازاں (تقریباً پچاس سال بعد) انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی مقصد قرار پائی۔ اسے بعد میں متحدہ قومیت کا عنوان دیا گیا۔

دوسرے مرکز صادق پور کا طریقہ کار اور لائحہ عمل وہی انقلابی رہا یعنی ہجرت' جہاد اور انگریز کو ملک بدر کرنے کے لئے تن من دھن کی قربانی۔ جو لوگ انقلابی اور جنگی نقطہ نظر رکھتے تھے وہ مجاہدین کے گروہ میں شامل ہوتے رہے۔

اس کے برعکس بے شمار محب وطن اور فدائین جو ترک وطن کر کے محاذ آزادی پر نہ جا سکتے تھے' انہوں نے انقلابیوں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا اور وہ اپنی تنخواہوں کا ایک خاصہ حصہ بطور خاص ستیانہ کیمپ بھیجا کرتے تھے۔ جو زیادہ جوشیلے تھے وہ فدائین کے لشکر میں شامل ہو کر دل کی بھڑاس نکالتے۔



[1] منشی محمد جعفر تھانیسری کے مطابق ان مجاہدین نے مولانا نصیر الدین کو اپنا امیر منتخب کیا اور سید اکبر کے پاس "ستیانہ" میں جمع ہو گئے۔ (سوانح احمدی صفحہ ١٨٠)

نیا ابھر

مولانا ولایت علی ایک با اثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا احمد علی "اردل" کے قاضی تھے' اس خدمت کے صلہ میں بادشاہ وقت کی طرف سے انہیں بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ آپ کی پرورش آپ کے نانا رفیع الدین حسن خان' صوبہ بہار کے آخری ناظم' دولت مند اور باوجاہت رئیس نے کی تھی۔

مولانا ولایت علی جب سن شعور کو پہنچے تو ایک پر تکلف اور بانکے نوجوان تھے۔ اعلیٰ قسم کا زربفت و زردوز' عطر میں بسا ہوا' آنکھوں میں سرمہ' دانتوں میں مسی اور ہتھیلیوں پر رنگ حنا' کاکلین آہن تاب پشت پر پڑی ہوئی اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے' چوڑی دار پائجامہ اور پیروں میں زردوز وسلی کی جوتیاں۔ زمانے کے فیشن کے مطابق خاندانی رواج کے مطابق آپ نے خاندانی اساتذہ سے تعلیم پائی۔ تکمیل علم کے لئے لکھنؤ گئے اور وہاں کے مشہور عالم و ماہر معقولات مولانا محمد اشرف سے عرصہ چار سال تک فیضیاب ہوتے رہے۔

اسی زمانہ میں سید احمد شہیدؒ لانگ مارچ کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے' زبان خلق کے ذریعے ان کے اس عجیب و غریب قافلے کا چرچا مولانا محمد اشرف تک پہنچا۔ منطق و فلسفہ کے ذوق نے آپ کو تفتیش و تحقیق کا خوگر بنا دیا تھا چنانچہ آپ نے سید احمد شہیدؒ سے تنہائی میں ملاقات کی۔

یہ مولانا ولایت علی ہی تھے جنہوں نے اپنے معزز استاد مولانا محمد اشرف کی ملاقات کیلئے سید احمد شہیدؒ سے وقت لیا اور جو اس وقت تخلیہ میں ثالث ثلاثہ بھی تھے۔ مولانا محمد اشرف سید احمد شہیدؒ اور مولانا ولایت علی کے مابین یہ ملاقات قریباً دو گھنٹے

جاری رہی۔ سید احمد شہیدؒ نے شاہ پرستی کے پرانے کھنڈرات کو پیوند خاک کرنے اور شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کے مطابق نئے نظام حکومت کے قیام کے موضوع پر جو گفتگو کی' اس کے ایک ایک لفظ نے صداقت پسند استاد اور نوجوان شاگرد پر جادو کا اثر کیا۔

منطق و فلسفہ کی موشگافیاں ہوا ہو گئیں۔ دل و دماغ کے تمام گنجینے متاع درد کی نذر ہو گئے اور ہمدردی خلق کا درد ان کے گوشہ جگر میں اس طرح پناہ گزین ہوا جس نے نہ صرف ان کو بلکہ مولوی ولایت علی کے عزیز و اقارب کو تمام عمر کیلئے بسمل نیم جان بنا گیا۔ اس دوران استاد و شاگرد دونوں کی داڑھیاں روتے روتے تر ہو گئیں۔

ہندوستان کو برطانوی سامراج سے نجات دلانے کے لئے جب سید احمد شہیدؒ نے آزاد علاقے کی جانب ہجرت کا قصد کیا تو مولانا ولایت علی اور ان کے خاندان کے بعض دیگر افراد ان کے ہمرکاب تھے۔

آزاد قبائل میں مرکز کے قیام کے بعد مولانا ولایت علی سفارت کابل کے لئے نامزد کیے گئے۔ انقلابیوں کا نوجوان سفیر جب کابل پہنچا تو اس نے وہاں تبلیغ و اصلاح کا راستہ بھی اختیار کیا اور حالات سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم بھی رقم کی۔ کابل سے واپسی پر آپ کو حیدر آباد میں انقلابی جدوجہد کیلئے متعین کیا گیا۔[1]

حیدر آباد میں آپ کی تحریک کامیاب ہوئی۔ نواب ناصر الدولہ کا دور حکومت تھا۔ اس کے بھائی مبارز الدولہ نے آپ کی دعوت قبول کر لی مگر انگریزوں کی وفادار ریاست کا حاکم مولانا ولایت علی کے ندائے تلخ کیونکر برداشت کرتا۔ چنانچہ دو سال کے مختصر عرصہ کے بعد آپ کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ آپؒ کے معتقد مبارز الدولہ کو نظر بند کر دیا گیا جبکہ اس کے ساتھی ریاست بدر کر دیئے گئے۔

مولانا اب بمبئی تشریف لے گئے' ابھی آپ وہاں پوری بساط عمل بچھانے بھی نہ پائے تھے کہ معرکہ بالاکوٹ کے درد انگیز سانحہ نے آپ کو اپنی جدوجہد کو نئی شکل دینے پر مجبور کر دیا۔

اس دوران پٹنہ میں آپ کے والد مولانا ماجد علی وفات پا گئے۔ چنانچہ برہان پور' جبل پور' نرسنگھ پور' کندولی اور سیونی کا دورہ کرتے ہوئے آپ دو سال میں پٹنہ پہنچے اور کتاب انقلاب کے منتشر اوراق کی ترتیب میں مشغول ہو گئے۔

---

[1] سوانح احمدی صفحہ ۲۱۱

جماعت مجاہدین کی تشکیل نو

پٹنہ پہنچ کر مولانا ولایت علی نے تازہ سرگرمیوں کے لئے پرانے ساتھیوں کو منظم کیا اور اپنا مرکز صادق پور کو بنایا۔ اس جماعت کے رہنما ارکان میں' مولانا سید محمد علی رام پوری' مولانا شاہ محمد حسین اور مولانا عنایت علی (مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی) اہم اور تحریک کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔

انقلاب کی تحریک کو عوامی سطح پر پھیلانے کے کیلئے آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا طریق منتخب کیا۔

عام مجمعوں میں تقاریر' مجمعوں اور میلوں (مثلاً بہار کا میلہ چراغاں) میں تبلیغ کی غرض سے اپنے ساتھیوں سمیت پہنچتے۔ کھیتوں میں کسانوں' کارخانوں میں مزدوروں کو وعظ و پند کرتے اور ان کی بدتمیزی اور غصہ کو خاموشی سے پی جاتے۔

اس سفر کے دوران آپ گاؤں گاؤں جاتے' قیام کرتے اور تحریک کا انقلابی پیغام لوگوں تک پہنچاتے۔ اس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنے میں خاصہ وقت صرف ہوتا۔ نماز جمعہ کے لئے کچھ مساجد مخصوص کر دی گئی تھیں۔ جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز ہوا کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ جہاد پر زور دیا جاتا تھا۔[1]

خاص مجمعوں میں درس' مکان پر نماز ظہر تا عصر قرآن و حدیث کا درس دیتے' مولوی عبداللہ (آپ کے بڑے بیٹے) قاری ہوتے۔ دیگر علماء ہاتھ میں تفسیر کی کتب رکھتے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہمراہ مریدوں کی بھاری صف ہوتی۔[2]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ از ولیم ہنٹر صفحہ ۱۳۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۳۴

تصنیف وتالیف: آپ نے ضرورت کے مطابق مختصر اور عام فہم رسالے قلم بند فرما کر لوگوں کے حوالے کیے۔ اس قسم کے رسائل کی تعداد ۱۰۰ سے کم نہ رہی ہو گی۔ اگرچہ صرف چند رسالے اب تک دریافت ہو سکے ہیں۔ [۳]

مولانا ولایت علی نے مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی سے مولانا شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن اور مولانا شاہ اسماعیل شہید کے تصنیف کے تمام رسالے جمع کیے اور دورہ بنگال کے دوران اپنے ایک مرید مولانا بدیع الزمان بردوانی کے ذریعے ان کی طباعت کا بندوبست کیا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس ضمن میں رقمطراز ہے:

''انگریزوں کے خلاف ضرورت جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم ونثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیشین گوئیوں سے پر اور ضرورت جہاد کے لئے وقف ہے۔[۴] بعض کتابیں تو ان میں حد سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں اور مسودات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

ان کا زہریلا پن ان کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلغین کے اس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ روح پھونک دی جاتی ہے، بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے''۔

تقسیم کار اور تنظیمی سرگرمیاں

جماعت کے مختلف ارکان کے ذمہ مختلف کام اور علاقے سونپ دیئے گئے تھے مولانا ولایت علی جو انقلابیوں کی جماعت کے امیر تھے اور عام طور پر جنہیں ''بڑے

[۳] الدر المنثور

[۴] ہمارے ہندوستانی مسلمان: صفحہ ۹۹، ۱۰۰

حضرت'' کہا جاتا تھا تحریک کے عمومی نگران مقرر ہوئے۔ بیرونی ممالک سے رابطہ قائم کرنا آپ کے فرائض میں داخل تھا۔

نیز پٹنہ میں قیام کے دوران نواب فخر الدولہ کی مسجد میں نماز جمعہ اور نماز کے بعد تقریر آپ کے ذمہ تھی۔ باقی دنوں میں تقاریر اور درس وتدریس کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پارٹی کے خاص ارکان کے علاوہ تحریک کے ہمنواؤں میں تبلیغ کا سلیقہ پیدا کر کے انہیں قصبوں اور دیہی علاقے کے لوگوں کی ہدایت کیلئے بھیجا جاتا تھا۔

مولانا محمد علی رام پوری: آپ کو حسب سابق جنوبی ہند کے علاقے میں متعین کیا گیا جس کا مرکز مدراس تھا۔

شاہ محمد حسین کو صوبہ بہار سپرد کیا گیا۔ انہوں نے وطن عزیز کو چھوڑ کر بنگال میں قیام فرمایا اور وہاں کئی برس گزار دیئے۔ ان کی جدوجہد اور جذبہ جہاد کے متعلق ولیم ولسن ہنٹر کہتا ہے کہ:

''پٹنہ کے خلفاء، جو انتھک واعظ، خود اپنے آپ سے بے پروا، بے داغ زندگی بسر کرنے والے، انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف، روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کیلئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔

وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور ان کے لئے ایک مثال تھے۔ ان کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انہی کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی''۔[۵]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین کا طریق کار انقلابی ہوتا گیا۔ انہوں نے پٹنہ کے دار الاشاعت کو انقلابیوں اور حریت پسندوں کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ اس کے اردگرد دیواروں اور حجروں کی بھول بھلیاں بنائی گئیں جو خفیہ دروازوں کے ذریعے

[۵] ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوئم صفحہ ۱۰

ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کیئے گئے جہاں پر انقلابی راز داری کے ساتھ مشورہ کرتے تھے۔ پہلے خلفاء نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کے خلاف مسلح مدافعت کی دھمکی دی تھی مگر ان کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچ دار راستوں کی شکل میں اختیار کیا۔ حتیٰ کہ حکومت کو انقلابیوں کے خلاف کارروائی کے لئے اس عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا۔[۱]

ہر ضلع کے مبلغین، متعصب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے' ان میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھڑکا دیتے' چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔

ان میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو ان کو ان کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا۔[۲]

اس دوران خود مولانا ولایت علی اور مولانا محمد علی نے جنوبی ہند اور بنگال کا دورہ کیا اور مدبرانہ تنظیم کے ذریعے مبلغین کو اس قابل بنا دیا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے وہ اپنا مرکز قائم کر لیتے۔ ایسے مبلغین وقتاً فوقتاً دورے کرتے اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو تحریک کی طرف راغب کرتے۔

انقلابیوں کی تحریک جنوبی ہند میں اس قدر کامیاب ہوئی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں جمع کروا دیئے۔ شمال مغربی صوبوں سے انگروؤں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی جانب روانہ کیں اور ہر جگہ پر مبلغین نے عوام کے جوش کو انتہا پر پہنچا دیا۔

---

۱ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد سوم صفحہ ۲۸

۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوئم صفحہ ۷۵۔

پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ:

"ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسران کے زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ وفساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا"۔

حریت پسندوں کی ایک انقلابی جماعت مشرقی اضلاع میں بہت سرگرم تھی۔ یہ فرازی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے سرغنہ نثار علی عرف ٹیٹو خان نے ۱۸۳۱ء میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔

مولانا یحییٰ علی نے ان کو بھی انقلابیوں کی تنظیم میں شامل کر لیا تھا جس کی وجہ سے ۱۸۴۶ء میں اس جماعت کے ارکان کی تعداد اسی ہزار تک پہنچ گئی۔ اس تنظیم کے ارکان آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے تھے اور انتہائی سرگرمی سے جماعت ہر کام سرانجام دیتے تھے۔

ان کی شجاعت اور بہادری کی تعریف کرتے ہوئے ولیم ولسن ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے صفحہ ۱۴۵ پر لکھتا ہے کہ:

"درہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی تھی کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ بعض حالات کے تحت ایک بنگالی بھی اس بے جگری سے لڑ سکتا ہے جس طرح ایک افغانی"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶ پر وہ لکھتا ہے کہ:

"یہ شر انگیزی یہاں تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لیے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے؟ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے اور ان کے خلاف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو ان کے مرید ہوں لیکن ان کا حال

یہ ہے کہ اپنے سردار سے غداری کے بجائے وہ موت کو ترجیح دیتے ہیں''۔

ایک اور جگہ پر لکھتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ:

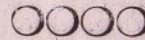
''گو یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیان ثابت ہوتے ہیں مگر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔ ان میں سے اکثر خداترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں''۔

مولانا ولایت علی نے جب محسوس کیا کہ اب صادق پور پٹنہ میں تحریک کی مرکزیت مضبوط ہو چکی ہے تو آپ بنگال تشریف لے گئے جہاں آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی دو سال سے کام کر رہے تھے۔

بنگال میں شہروں اور دیہات کا دورہ کرتے ہوئے آپ کلکتہ پہنچے وہاں سے بمبئی اور بمبئی سے حجاز تشریف لے گئے۔ بمبئی میں قیام کے دوران آپ نے مولانا عنایت علی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور مع اہل وعیال مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

حج سے واپسی پر آپ مولانا عنایت علی کو بمبئی سے ہمراہ لے کر کلکتہ پہنچے اور بنگال کا دورہ کرتے ہوئے تحریک کے مرکز صادق پور پٹنہ میں فروکش ہوئے۔ آپ نے جماعت کی مرکزی لیڈرشپ میں مولانا زین العابدین حیدر آبادی اور مولانا محمد عباس کو جو کسی طرح حیدر آباد سے فرار ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت پٹنہ پہنچے تھے' کو شریک کر لیا اور تنظیم کے لئے اڑیسہ اور الہ آباد کا علاقہ ان کے سپرد کیا۔

ابتدائی منازل طے ہو چکی تھیں اور حریت پسندوں کی نگاہیں آزاد سرحد کی جانب اٹھ رہی تھیں کہ سید ضامن شاہ کی درخواست پہنچی جس میں گلاب سنگھ (کشمیر کے راجہ) کے خلاف مدد کیلئے کہا گیا تھا۔ ان کی مدد کے لئے مولانا عنایت علی کو بھیجا گیا۔ بعد ازاں خود مولانا ولایت علی بھی بالا کوٹ پہنچے اور انقلابیوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔



صادق پور کے انقلابی میدان جنگ میں

۱۸۴۵ء۔ ۱۸۴۶ء کا دور ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سکھ حکومت کے خلاف برطانوی سامراج کی تمام سازشیں کامیاب ہو رہی تھیں۔ گلاب سنگھ راجہ جموں کی انگریز دوستی طشت از بام ہو چکی ہے۔ مفاد پرست اور خودغرض عہدیدار انگریز کے مقابلہ سے جان بچا رہے ہیں اور اسی گلاب سنگھ کو پورے پنجاب کا وزیر اعظم بنا کر ''کمپنی سرکار'' سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔

دوسری طرف وطن کے دفاع کے لئے ہندوستانی عوام کے جذبات بھڑک رہے ہیں۔ ایک ایک محب وطن انگریز کے مقابلے کے لئے سربکف اور کفن بدوش ہے۔ بقول مسٹر دیبی پرشاد ''پورے ہندوستان' بالخصوص شمال مغربی صوبہ میں غلغلہ مچ رہا تھا''۔[1]

اس زمانہ میں بالا کوٹ کا رئیس سید ضامن شاہ بھی اپنے علاقے کی حفاظت کیلئے اپنے حریف راجہ گلاب سنگھ کے مقابلہ میں آتا ہے۔ اسے اپنے حریف کی فوجی طاقت اور انگریزوں کی پشت پناہی کے سبب اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ اس احساس کے پیش نظر وہ امیر تحریک ولی اللہ' مولانا ولایت علی بانی مرکز صادق پور سے امداد کی درخواست کرتا ہے۔

مولانا ولایت علی جو حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں' سید ضامن شاہ کی اپیل کا ذکر تحریک کے رہنماؤں سے کرتے ہیں۔ بعد ازاں انقلابیوں کا پانچ سو حریت پسندوں پر مشتمل ایک دستہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی کمان مولانا عنایت علی کے سپرد کر

۱۔ گلشن پنجاب: صفحہ ۱۰۹

کے بالاکوٹ کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد مولانا ولایت علی نے بھی رخت سفر باندھا۔ وہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء بروز جمعہ بالاکوٹ پہنچتے ہیں اور مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔

مولانا ولایت علی کے رفقا میں' بنگال و بہار کے مجاہدین کے علاوہ مرکز صادق پور کے مختلف افراد مولانا فیاض علی' مولانا یحییٰ علی' مولانا اکبر علی جو حیدر آباد کے ممتاز عالم دین مولانا الٰہی بخش کے بیٹے ہیں اور مولانا احمد اللہ کے بھائی تھے' شامل تھے۔ [۲]

مولانا ولایت علی کے رفقاء نے بالاکوٹ روانگی سے قبل صادق پور کا مرکز مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کے حوالے کیا جنہوں نے اس اہم مرکز کے ہمہ گیر نظام کو اپنی زندگی کے آخری لمحہ ۱۸۵۸ء تک پورے نظم وضبط کے ساتھ قائم رکھا۔

انقلابی مجاہدین کے چند حملوں نے گلاب سنگھ کا نشہ ہرن کر دیا اور وہ صلح کی درخواست کرنے لگا مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ حریت پسندوں نے جسے اپنا سمجھا تھا اور جس کی امداد کے لئے وہ ایک طویل سفر طے کر کے بالاکوٹ پہنچے تھے وہ بھی خود غرض نکلا۔

اگر چہ گلاب سنگھ اور ضامن شاہ دو حریف تھے۔ دونوں کے مذہب بھی جدا تھے اور نعرے بھی جدا مگر خود غرضی کے مندر میں شاہ اور سنگھ دونوں ہی ایک ہی طرح کے پجاری تھے۔

یہاں کفر کی پہچان تھی اور نہ اسلام کا امتیاز مگر دونوں اقتدار کے پجاری تھے۔ پھر مولانا ولایت علی جو ایک مقدس مشن کے لئے اس کی امداد کو پہنچے تھے کیونکر اس کی چوکھٹ اقتدار پر سر جھکاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گلاب سنگھ کی شکست اور مجاہدین انقلاب کی شان و شوکت ضامن شاہ کو اکھرنے لگی۔

اس واقعے کے بعد ابھی ایک سال کا قلیل عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ الحاق پنجاب کے منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہوا اور انگریزی فوجیں ۱۸۴۶ء تک ستلج کے پار نہ آ سکی

۲ الدار المنثور صفحہ ۱۴۱ اور ۱۴۲

تھیں' اب پنجاب کے چپہ چپہ پر پھیلنے لگیں۔ کمپنی سرکار کے لیفٹیننٹ گورنر جو راجہ دلیپ سنگھ اور مہارانی چندا کو برداشت نہ کر سکتے تھے وہ مولانا ولایت علی' علماء اور ان کی بے پناہ فوج کو کیسے گوارہ کرتے؟

ان حالات میں انگریز سامراج نے ایک مرتبہ پھر وہی پالیسی اختیار کی جو وہ ''سمہ'' کے علاقے میں انقلابیوں کے قتل عام کے سلسلے میں استعمال کر چکا تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ ضامن شاہ کی اقتدار پسندانہ طبیعت سے فائدہ اٹھایا اور انہی قبائل کو جن کی نجات کے لئے انقلابی حریت پسندوں کا یہ لشکر خاک و خون سے کھیل رہا تھا' مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔

نفرت انگیزی کے لئے وہابیت کا پرانا الزام دہرایا گیا۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری مصنف الدر المنثور و منشی محمد جعفر تھانیسری مصنف سوانح احمدی کے مطابق:

''فوجی افسر وینس ایگنیو اور لیفٹیننٹ لمسڈن تھوڑی سی سے فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور مجاہدین کے علاقے کے قریب کیمپ قائم کر دیا۔ یہاں سے خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے انہوں نے علاقے کے لوگوں کو مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا۔

سید ضامن شاہ نے بھی بے وفائی کی۔ اب پوری راز داری کے ساتھ ایک تاریخ مقرر کر کے سارے مفتوحہ علاقے میں غدر کرا دیا۔ عُمال یعنی مجاہدین کے مقامی افسر اور مجاہدین کی پولیس کے ذمہ دار قتل کر دیئے گئے۔ گویا اپنی دانست میں اس تحریک کی جڑیں اکھاڑ دی گئیں۔ افسوس صد افسوس [۳]

بالاکوٹ اور سید ضامن کی ریاست کے علاقے میں انقلابیوں کے اس قتل عام کے بعد مولانا ولایت علی نے سوات کا ارادہ کیا۔ راستے میں کمپنی سرکار کا علاقہ پڑتا تھا۔ جب لشکر مجاہدین اس علاقے میں پہنچے تو انگریزی فوجوں نے دفعتہً محاصرہ کر لیا۔

مولانا عبدالرحیم (مولانا ولایت علی کے بھتیجے) کے مطابق ''آپ حضرات نے

۳ علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد سوئم صفحہ ۵۱ اور ۵۲)

اطاعت قبول کر لی اور مجاہدین کے دستوں اور روہیلہ فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ راستہ میں سے مجاہدین کی کثیر تعداد فرار ہو گئی اور علاقہ سوات میں پہنچ کر زیر قیادت میر اولاد علی صاحب ستیانہ کیمپ میں داخل ہو گئی۔

آپ دونوں بھائی باقی مجاہدین، روہیلہ لشکر اور گرفتار شدہ توپ خانہ اور سامان جنگ کے ساتھ لاہور پہنچے۔ جان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے دو منزل آگے بڑھ کر گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا۔

اس نے آپ کی شجاعت کی داد دی اور اس موقع پر آپ نے ہتھیار ڈال کر جس تدبر سے کام لیا تھا اس کی تحسین و آفرین کی اور آپ سے درخواست کی کہ توپ خانہ اور سامان جنگ گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کر کے روہیلہ فوج کی تنخواہ ادا کر دی جائے۔ باقی پانچ سو مجاہدین کو اپنے ساتھ لے کر وطن تشریف لے جائیں۔

مولانا ولایت علی صاحب نے اس کو بھی منظور کیا۔ اب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چیف کمشنر نے ایک روز حکومت کی طرف سے دوسرے روز خاص اپنی طرف سے آپ کی اور آپ کے ساتھ مجاہدین کی دعوت کی۔ تیسرے روز مولوی رجب علی، میر منشی چیف کمشنر پنجاب نے سب حضرات کی دعوت کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کے خرچ سے اہتمام واکرام کے ساتھ آپ سب کو معہ جملہ مجاہدین کے پٹنہ پہنچا دیا گیا۔

یہ لوگ پٹنہ پہنچ کر پہلے چیف کمشنر کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ کمشنر صاحب نے بڑے تپاک و گرمجوشی سے آپ کا خیر مقدم کیا اور اندر لے جا کر آپ سے فرمایا کہ گورنمنٹ آپ دونوں سے دو سال کے لیے مچلکے لینا چاہتی ہے۔ دونوں بھائیوں نے یہ بھی منظور کیا اور مچلکوں پر دستخط کر دیئے۔ پھر وہاں سے رخصت ہو کر مکان پر تشریف لائے۔

پورا شہر آپ کی زیارت کے لئے بے تاب تھا اور آپ کے پہنچنے سے پہلے کمشنر صاحب کی کوٹھی پر ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس دو سال کے عرصہ میں بدستور سابق وعظ و نصیحت، مراقبہ و مشاہدہ میں مصروف ہو گئے اور صوبہ جات میں تبلیغ و ارشاد کے لئے دوسرے شروع کر دیئے۔ مختلف اضلاع اور صوبوں میں مبلغین کو روانہ کر دیا اور چند ماہ

بعد مولانا عنایت علی صاحب کو بنگال روانہ کر دیا۔[ؑ]

مولانا ولایت علی کی وفات

مولانا ولایت علی کو مشن کی تکمیل سے قبل ہندوستان واپسی کا بہت رنج تھا۔ اکثر دوپہر اور رات کو کھلے آسمان کے نیچے کھڑے آہ وزاری کرتے اور کبھی مسجد میں انتہائی عاجزی اور بے قراری سے دعائیں کرتے۔ مچلکے کی معیاد پوری ہونے پر چند مخلصین کے ہمراہ سوات روانہ ہو گئے اور چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کو لکھ بھیجا کہ ضروری کاموں سے فراغت کے بعد سوات پہنچو۔

پٹنہ سے روانہ ہوئے تو قریہ قریہ، شہر شہر وعظ و نصیحت اور ہدایت کی شمعیں روشن کرتے چلے۔ پٹنہ سے دہلی تک تقریباً ڈیڑھ برس میں پہنچے۔ دہلی میں دو ماہ قیام کے بعد آپ لدھیانہ آئے اور مولانا عنایت علی کے انتظار میں ''سرائے کھنا'' میں قیام فرمایا۔ مولانا عنایت علی کے پہنچتے ہی چند ہمراہیوں کے ساتھ سوات روانہ ہو گئے۔

آپ کی آمد کی خبر پا کر والی سوات سید اکبر شاہ نے انتہائی گرمجوشی سے مع لشکر مجاہدین کی پیشوائی کی۔ آپ کی ہجرت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور حریت پسندوں نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان سے سوات کا رخ کرنا شروع کر دیا۔

سوات پہنچ کر آپ تبلیغ وارشاد اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ بعد ظہر درس دیتے اور صبح کے وقت لوگوں کو مراقبہ اور مشاہدہ میں توجہ دلاتے اور ایک معین وقت انقلابیوں کی فوجی تربیت اور مشق فن سپہ گری کے لیے مخصوص تھا۔

ابھی مشن کا دوبارہ آغاز اور قتال وجدال کا سلسلہ شروع بھی نہ ہوا تھا کہ رحمت الٰہی نے یاد کیا۔ محرم ۱۲۶۹ھ بمطابق ۱۸۵۲ء میں بعارضہ چونسٹھ سال کی عمر میں سرحد میں وفات پائی اور ستھانہ میں دفن کیے گئے۔



ؑ الدار المنثور صفحہ ۱۲۴

مولانا عنایت علی

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد امارت کا بوجھ مولانا عنایت علی کے کندھوں پر آن پڑا۔ آپ مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ تیس سال کی عمر میں حضرت سید احمدؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ بیعت سے وفات تک ان کے مشن کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہے۔ مولانا ولایت علی کے معتمد اور دست راست تھے۔

آپ نے تقریباً سات سال تک بنگال کا دورہ کر کے ایسا نظم ونسق قائم کیا جو تقریباً چالیس سال تک انقلابی مجاہدین کی جدوجہد میں کمک کے طور پر مجاہد اور روپیہ فراہم کرتا رہا۔ آپ نے مولانا شریعت اللہ کے ماننے والوں کو جو ''فرازی'' کہلاتے تھے تحریک میں شریک کیا۔

اس کے علاوہ نثار احمد عرف ٹیٹو میاں کے ساتھیوں نے بھی آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ آپ ابھی بنگال میں مصروف جدوجہد تھے کہ سید ضامن شاہ کی اپیل پر بالاکوٹ میں ایک نیا مورچہ کھولا گیا تو جس شخص نے اس محاذ پر فتح وکامرانی کا جھنڈا گاڑا وہ مولانا عنایت علی ہی کی شخصیت تھی۔

۱۸۵۰ء میں مولانا ولایت علی نے دوبارہ سرحد کا رخ کیا تو آپ بھی اپنے حصہ کی تمام جائیداد فروخت کر کے مع اہل وعیال سرائے کھنا پہنچ گئے۔ سوات پہنچ کر آپ نے کچھ عرصہ بھائی کے ساتھ کام کیا۔ بعد ازاں آپ نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف علیحدہ مورچہ جما لیا۔

مولانا مسعود عالم، مصنف ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' صفحہ ۶۲ پر رقمطراز

ہیں کہ ''مولانا ولایت علی جہاد کی تیاری میں وقت صرف کر رہے تھے۔ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے۔

ان کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیے۔ جہاں داد خان والی انب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی مگر مولانا ولایت علی نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازی کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے۔

اس ضمن میں ان کے ہمعصر انگریزوں کی رائے یہ ہے کہ ''جہاں داد خان والی انب ہمارا حلیف[1] تھا سید اکبر شاہ کے لڑکے مبارک شاہ نے عنایت علی کے ساتھ ''مردان'' کے قلعہ پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا۔ لیکن اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا' تب عنایت علی نارنجی چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو ورغلانے کی کوشش کی''۔[2]

ان دو شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قلعہ ''مردان'' کی مہم کی ناکامی کے بعد مولانا ولایت علی نے اسی محاذ کو مضبوط بنانے پر زور دیا جبکہ مولانا عنایت علی نے اس بات کو کافی نہ سمجھا بلکہ ایک دوسرا محاذ بھی قائم کر دیا۔ یہ یوسف زئی کا علاقہ تھا جہاں سید عباس رئیس علاقہ کے تعاون سے آپ نے منگل تھانہ کو اپنا مسکن بنا کر ایک نیا محاذ بنایا۔

مولانا ولایت علی کی وفات کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ تشریف لے گئے جو انقلابی مسلمانوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ آپ کے وہاں پہنچنے پر تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

زمام قیادت سنبھالتے ہی آپ نے انگریزوں کے حلیف جہاں داد خان پر حملہ کیا۔ آپ کا حملہ کامیاب رہا اور جہاں داد خان کی قوت منتشر ہو گئی۔ انگریزوں کو اپنے

۱۔ مسٹر ٹی ای راونشا (T.E. Revinshan) مجسٹریٹ پٹنہ ۱۸۶۵ء کا میمورنڈم نیز ہمارے ہندوستانی مسلمان' ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۳۸

۲۔ ایچ ڈبلیو بیلیو لاہور ۱۸۶۴ء کی جنرل رپورٹ متعلق یوسف زئی بحوالہ اسلامی تحریک

حلیف کی امداد کے لئے بار بار کمک بھیجنا پڑی جو ہر بار ناکام رہی۔ مگر بعد ازاں اکبر شاہ کے لڑکوں نے مولانا عنایت علی سے بے وفائی کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی عام جدوجہد نے انقلابیوں کی امداد کے راستے مسدود کر دیئے۔ نیز انگریزوں کی تازہ دم فوجوں نے ہندوستان میں آزادی کی جنگ لڑنے والے حریت پسندوں کی کوششوں کو ناکام بنانے کے بعد اب ان مجاہدین پر لشکر کشی کی اور انہیں پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران ۱۸۵۸ء کے آخر میں آپ کو پیغام اجل آ گیا۔

مولانا عبدالرحیم الدر المنثور کے صفحہ ۱۳۸ پر رقمطراز ہیں'

''۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راستے پر خطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے' جانوں کو امن نہ تھا پھر کس کو ہوش تھا اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جا سکتا۔ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔

درختوں کی کونپلوں اور پتیوں سے اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں' آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ آپ مہاجر و انصار پر صرف کر چکے تھے اور تھا بھی کیا اونٹ کے منہ میں زیرہ۔

اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی تلخ تھی' مگر اس صبر و استقامت کے پہاڑ نے پورے صبر و تحمل کے ساتھ راضی برضا رہتے ہوئے اللھم بالرفیق الاعلی سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار وضیق النفس ۱۸۵۸ کے آخر میں رحلت کی''۔

ولیم ولسن ہنٹر انقلابی مسلمانوں کی سرگرمیوں کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''۱۸۵۲ء میں مجاہدین نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنچانے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔ روپیہ اور آدمی ہمارے علاقوں سے

ستھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔

اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی یعنی انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔

اگر وہ ہمارے صوبے پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے ان کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ ان خطوط سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔"

انہی دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس انگریزی صوبہ کے دار الخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی اعلانیہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ پولیس بھی انہی دیوانوں کی طرف دار تھی اور اس کے لیڈروں میں ایک نے اپنے مکان پر سات (۷۰۰) آدمی اس غرض سے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلے میں کوئی مزید تفتیش ہوئی تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے گا۔

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا اس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھ بند نہ کر سکتی تھی۔ اسی سال (۱۸۵۲ء) میں انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں ان بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کے باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔

ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا، یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوج مہموں کی گنتی ۲۰ تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ۶۰ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔

اس اثناء میں ستھانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا، نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا لیکن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنیاد ڈالی جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصہ لیا۔

اس سال ان لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ اس علاقے میں معین سرکاری افسروں سے تحویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لیفٹیننٹ ہورن کے کیمپ پر شب خون مارا، جو اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔

اس کا بدلہ لینے کے لئے اب زیادہ دیر نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ سر سڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گیا (جس کی تفصیل یہ ہے۔ توپ خانہ ۲۱۹، سوار ۵۵۱، پیدل ۴۱۵۷، کل ۴۸۸۷ باقاعدہ فوج)......

بڑی دقت کے بعد جنرل سر سڈنی کوٹن کی فوج سے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار اور ستھانہ کی باغی نو آبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ وہ مہابن پہاڑیوں کی دشوار گزار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اپنی قوت کو ذرا بھی ضعف نہ پہنچنے دیا کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر انہیں ایک نو آبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔[۳]

---

[۳] ہمارے ہندوستانی مسلمان (صفحہ ۳۷ تا ۴۰)

مولانا عنایت علی نے اپنے چھ سالہ مختصر دور امارت (۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۸ء) کے دوران انگریزوں کے خلاف براہ راست مہم جاری کی جس کی مدافعت میں سات سال کی مدت میں سولہ (۱۶) مرتبہ برطانوی فوجیں بھیجیں گئیں جن کی تفصیل گذشتہ سطور میں دی جا چکی ہے۔

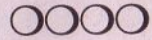
۱۸۵۷ء میں ہندوستان عمومی طور پر اور بالخصوص شمالی ہند انقلاب اور جنگ آزادی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس دوران مولانا عنایت علی نے انگریز سامراج کے خلاف سرحد کے علاقے میں انقلابیوں کے جذبہ حریت کو گرمائے رکھا اور برطانوی توسیع پسندوں کے ناک میں دم کیے رکھا۔

انقلابی مسلمانوں اور ستھانے کیمپ کی طاقت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ انگریزوں کو ان کے مقابلہ کے لئے ایک مضبوط فوجی مستقر قائم کرنا پڑا جس میں باقاعدہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار تک پہنچ گئی جبکہ ایک لاکھ چالیس ہزار بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی یعنی بے قاعدہ اور باقاعدہ فوج اور پولیس کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی۔

انقلابیوں کی ناکامی کے اسباب

- جہاں برطانوی سامراج نے طاقت کے زور پر انقلابیوں کو ختم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں وہاں اس نے سیاسی چالوں اور مکاری سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے کچھ قبائل کو ستھانہ کیمپ کے خلاف اکسا کر سید اکبر شاہ (ستھانہ کیمپ کے رئیس) کے بھائی سید عمر شاہ کو قتل کرا دیا۔
- اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے سرحدی قبائل کی ایک دوسرے سے رقابت سے مکمل طور پر فائدہ اٹھایا۔
- انقلابی مسلمانوں کے خلاف "وہابی" کا لفظ استعمال کر کے ان کے خلاف شر انگیز اور نفرت گزین پروپگنڈے سے کام لیا گیا۔
- ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سبب شمالی ہند سے ستھانہ کیمپ کی مالی امداد بند ہو گئی نیز آدمیوں کی کمک بھی رک گئی۔

- ستھانے کیمپ کے گرد انگریزوں نے اپنی فوجی کارروائیوں کا دائرہ تنگ کر دیا۔ دریں اثناء کچھ قبائل نے انقلابیوں کے خلاف ہنگامے برپا کر کے ان کا عرصہ حیات تنگ کر دیا۔
- انگریزوں اور ان کے پروردہ قبائل کی بے پناہ یورش کی وجہ سے مجاہدین ستھانے سے ہٹ کر مہابن میں جمع ہو گئے مگر مالی دشواریوں کے سبب وہ مصائب میں اس قدر گھر گئے کہ انہیں ایک عرصہ تک کونپلوں اور درختوں کے پتوں پر گزارا کرنا پڑا۔ اسی حالت میں مولانا عنایت علی بیمار ہوئے اور رحلت فرما گئے۔



مولانا عنایت علی کے جانشین

مولانا عنایت علی کے انتقال کے بعد بھی حریت پسندوں نے انگریزوں کی بالا دستی گوارہ نہ کی اور انگریز سامراج کے خلاف مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ آپ کے انتقال کے بعد مولانا نور اللہ کو امیر چن لیا گیا مگر وہ دو سال بعد رحلت فرما گئے۔

اس طرح میر مقصود علی کو بطور نئے امیر کے منتخب کر لیا گیا۔ ان کے زمانے میں بھی انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی مگر ان کی زندگی نے بھی وفا نہ کی اور وہ بھی دو سال سے کم عرصہ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

اس طرح ۱۸۶۲ء میں امارت کی باگ ڈور ایک مرتبہ پھر مولانا ولایت علی کے صاحبزادے مولانا عبد اللہ کے سپرد کی گئی۔ جنہوں نے تقریباً چالیس برس تک انگریزی فوجوں کو خاک وخون میں نہلائے رکھا۔

ہندوستان میں ہزاروں محبان وطن کو سرحد کے انقلابیوں سے خط و کتابت کے جرم میں گرفتار کر کے عبور دریائے شور کر دیا گیا۔ عرصہ دراز تک پورے شمالی ہندوستان میں خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ حریت پسندوں اور ان کے معاونین کے خلاف یکے بعد دیگرے سازش کے پانچ مقدمات چلائے گئے۔

مولانا عبد اللہ ۱۹۰۲ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد امارت کی ذمہ داری ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبد الکریم کے کندھوں پر ڈال دی گئی جنہوں نے تقریباً تیرہ سال تک تحریک کو کامیابی سے چلایا۔

۱۹۱۵ء میں جب مولانا عبد الکریم کا انتقال ہوا تو برطانوی سامراج کا اقبال اپنے نقطہ عروج پر تھا مگر ہندوستان میں اب اس کے قائم کردہ نظام میں دڑاڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

ہندوستان میں جدوجہد آزادی

جس زمانہ میں ہندوستانی مسلمان اور سرحد کے غیور پٹھان، علما صادق پور کی زیر قیادت سرحدی علاقے میں انگریز سامراج کے خلاف برسرپیکار تھے، انہی دنوں قطب العالم میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے خلیفہ مولانا حافظ ضامنؒ برطانوی توسیع پسندوں کے عزائم پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ سرحد میں انقلابیوں کی ناکامی اور بعض قبائل کی حریت پسندوں کے مقابلہ میں انگریزوں سے وفاداری کے واقعات ان کے لیے دلی اضطراب اور قلق کا باعث بنے ہوئے تھے۔

مولانا حاجی امداد اللہ اور تھانہ بھون کے مولانا شیخ محمد (یہ دونوں حضرات بھی میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے خلفاء تھے) بھی ان حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ مولانا حاجی امداد اللہ انقلاب کی تحریک میں مولانا حافظ ضامن کے ہمنوا تو ضرور تھے مگر اس قدر جوش نہ رکھتے تھے جو حافظ ضامن کے دل و دماغ کو محصور کیے ہوئے تھا۔ جبکہ تھانہ بھون کے مولانا شیخ محمد کی رائے میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا فرض تو درکنار بلکہ جائز ہی نہ تھا۔

اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کو ان کے علاقوں سے بلوایا گیا۔ آپ دونوں حضرات سے پہلے حضرت شاہ عبد الغنی مجددی، حضرت شاہ احمد سعید مجددی اور حضرت مولانا مملوک علی و دیگر اساتذہ دہلی سے سند فراغ علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کر چکے تھے۔

دونوں حضرات کے پہنچنے پر ایک اجتماع میں جہاد کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا تو مولانا نانوتوی نے انتہائی ادب سے (اپنے چچا پیر) مولانا شیخ محمد سے دریافت کیا کہ

حضرت کیا وجہ ہے آپ دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو حضرت شیخ محمد نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں اور ہم بے سروسامان ہیں۔

مولانا نانوتوی نے عرض کیا! کیا اتنا سامان بھی نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد نے سکوت فرمایا' تب حافظ ضامن نے فرمایا کہ مولانا بس سمجھ میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا گیا اور جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی۔

حاجی امداد اللہ' امام متعین کیے گئے' مولانا محمد قاسم نانوتوی انقلابی فوج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی بنائے گئے' مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولانا حافظ ضامن تھانوی کو میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔

ان حضرات کے علم' تقویٰ اور پرہیزگاری کا اطراف و جوانب میں بے پناہ شہرہ تھا اور لوگ ان کے اخلاص' دینداری اور خدا ترسی کے سبب ان پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے تھوڑے سے عرصہ میں لوگ جوق در جوق ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس زمانے میں ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی نیز مسلمان ہتھیاروں کا رکھنا ضروری سمجھتے تھے مگر وہ ہتھیار پرانے طرز کے تھے جن میں توڑے دار بندوقیں اور تلواریں شامل تھیں۔

ہزاروں مجاہدین کے جمع ہو جانے پر ''تھانہ بھون'' اور اس کے اطراف کے علاقوں پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کر دی گئی اور ان علاقوں سے انگریزوں کے حکام کو نکال باہر کر دیا گیا۔

تھانہ بھون کے انقلابیوں کو خبر ملی کہ ایک توپ خانہ سہارنپور سے شاملی بھیجا گیا ہے جو ایک پلٹن کی نگرانی میں لایا جا رہا ہے۔ یہ پلٹن رات کو تھانہ بھون کے علاقے سے گزرے گی۔

اس خبر سے مجاہدین کو تشویش ہوئی کیونکہ ان کے پاس جو ہتھیار تھے ان میں برچھے' تلواریں اور توڑے دار بندوقیں شامل تھیں' جن سے توپ خانے کا مقابلہ نہیں کیا

جا سکتا تھا۔ تب مولانا رشید احمد گنگوہی نے انہیں اطمینان دلایا کہ فکر مت کرو۔

امام مجاہدین مولانا حاجی امداد اللہ نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو چالیس حریت پسندوں کا سردار مقرر کیا اور انگریزن پلٹن پر حملے کا مشن سونپا۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک باغ میں چھپ گئے۔

یہ باغ اس سڑک کے کنارے واقع تھا جس سے انگریزی سپاہ توپ خانہ لے کر گزرنے والی تھی۔ آپ نے اپنے ماتحتوں کو ہدایت کی کہ جب میں اشارہ کروں تو تمام لوگ ایک وقت میں ایک ساتھ فائر کھول دیں۔

چنانچہ انگریزی سپاہ معہ توپ خانہ مذکورہ باغ کے قریب سے گزری تو مسلمانوں نے مولانا گنگوہی کا اشارہ پاتے ہی یکدم فائر کیا۔ اچانک گولیوں کی آوازیں سن کر پلٹن بدحواس ہو گئی اور توپ خانہ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

مولانا رشید احمد گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر امام مجاہدین حضرت حاجی امداد اللہ کی مسجد کے سامنے ڈال دیا۔ اس واقعے سے اردگرد کے عوام اور مجاہدین پر ان حضرات کی فراست' ذکاوت' فنون حربیہ کی مہارت اور معاملہ فہمی کی دھاک بیٹھ گئی۔

اس زمانے میں ''شاملی'' کو مرکزی مقام کی حیثیت حاصل تھی' تحصیل ہونے کے سبب وہ سہارنپور کے علاقے میں ایک چھوٹی چھاونی تھی۔ اس لیے اس پر مسلمانوں کا قبضہ ضروری سمجھا گیا۔ اس منصوبہ پر بحث ہوئی' غور و فکر کیا گیا اور بالآخر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مولانا محمد ضامن کی زیر قیادت مجاہدین کے ایک گروہ نے ''شاملی'' پر حملہ کیا' وہاں موجود فوج اور پولیس انقلابی مسلمانوں کے حملے سے مغلوب ہو گئی مگر اس حملے کے نتیجے میں مولانا محمد ضامن شہید ہو گئے۔

ان کی شہادت اور سقوط دہلی کی خبر نے لوگوں کی ہمتیں پست کر دیں۔ تحریک انقلاب اور آزادی کی جدوجہد کی ناکامی کے ساتھ ہی ہندوستانی عوام کے گلے میں غلامی کا وزنی طوق ڈال دیا گیا۔ قصبہ تھانہ بھون اور اس کے اردگرد کے علاقے نیست و

نابود کر دیئے گئے اور بڑے پیمانے پر ہندوستانیوں کا قتل عام ہوا۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے انتہائی سفاکی اور بے دردی سے دہلی کو لوٹا اور عوام کا قتل عام کیا گیا۔ اسپنر وال پور اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہ مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی''۔

وال پول کا بیان ہے کہ !''تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے انتیس (۲۹) شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے''۔

مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس (۲۷) ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔[1]

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدار تمدن و تہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز مظالم زیادتیں جوش میں نہیں ہوش میں ہیں۔ اس نے یہ مظالم غلامی کی لعنت سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ فاتح اور قابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت و حماقت سے نہیں، بزعم خود دانش مندی و فرزانگی کے ماتحت کیں؛ غفلت و نادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔

خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا گیا وہ بیان سے باہر ہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا۔ سکھ رجمنٹ سے علیٰ رؤس الاشہاد اغلام کرانا۔ فتح پوری کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کو لٹکانا' مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہ جہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا' عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کو لید ڈالنا ناقابل معافی اور ناممکن التلافی جرم ہے۔ منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔[2]

---

[1] شاندار ماضی صفحہ ۴۹ از افسانہ غم صفحہ ۲۸' ۲۹' بحوالہ نقش حیات صفحہ ۴۷

[2] الثورۃ الہندیہ صفحہ ۱۶۱' ۱۶۲' بحوالہ نقش حیات صفحہ ۴۸

محرکات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور ناکامی کے اسباب

انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور جنگ کے لئے مسلمانوں کے نزدیک سب سے اہم محرک اور سبب یہ تھا کہ برطانوی سامراج نے بے عہدی' سازش اور فریب سے ہندوستان پر قبضہ کیا اور ان کو حکومت' آزادی اور اختیار سے محروم کر دیا۔ اپنی گم گشتہ آزادی اور خود مختاری کی بحالی اور واپسی کے لئے کوئی قوم جنگ یا بغاوت کرے تو یہ بات زندہ قوموں کے منشور میں قابل فخر ہوتی ہے نہ کہ باعث معذرت۔

ہندوستانی مسلمانوں کو بجا طور پر شکایت تھی کہ برطانوی جارحیت پسندوں نے انہیں معاشی حیثیت سے تباہ کر دیا' تعلیم کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ وہ اپنی پسند اور مزاج کے مطابق تعلیم حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ان کے لئے سب سے ناگوار بات یہ تھی کہ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلتیں کی گئیں۔

ہندوؤں کو انگریزوں سے ناراضگی تھی کہ ہندو والیان ریاست کو ان کے اس حق سے محروم کیا گیا جس کے تحت اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب وہ کسی کو متبنیٰ کر لیں۔ اسی بنیاد پر لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۸ء میں راجہ ستارا اور ۱۸۵۳ء میں راجہ ناگپور اور جھانسی کی رانی کے خلاف بورڈ آف ڈائریکٹرز کو لکھا کہ ان کو متبنیٰ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور ان کی ریاستوں کا الحاق کر لیا جائے۔ کمپنی پہلے ہی دیگر سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر اسی طرح قبضہ کر چکی تھی۔

فوج کو اپنی تنخواہوں اور شرائط ملازمت سے متعلق شکایت تھی۔ جس کے تحت انہیں سمندر پار خدمت پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ جبکہ ہندو' چھوت چھات اور کھانے پینے کی

پابندیوں کی بنا پر ان شرائط پر خاموش تھے۔

ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ مرہٹوں کے پیشوا باجی راؤ کو معزول کر کے انہیں جبور میں نظر بند کر دیا گیا ان کے مرنے کے بعد ان کے متبنٰی کو پینشن نہیں دی گئی جو تبور میں انتقامی جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔

دہلی کے شاہی خاندان کے متعلق انگریزوں کا منصوبہ تھا کہ بہادر شاہ کو مہرولی منتقل کر دیا جائے۔ اس کے جانشین کو خطاب' دربار و مراسم احترام شاہی سے محروم کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔

کمپنی کے حکام پادریوں اور مشن کی امداد کرتے' ان کے وعظ میں شرکت کے لیے ہندوستانی ملازمین کو مجبور کیا جاتا تھا۔ نیز انہیں مشنری کاموں کے لئے روپیہ فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ واعظین تیرتھ' منڈیوں اور مختلف اجتماعات کے موقعوں پر دوسرے مذاہب کے معتقدوں کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے۔

دیہی علاقوں اور شہروں میں کثرت سے مشنری سکول کھولے گئے اور عوام کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے وہاں بھیجیں۔ ان سکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جارہی تھی اور عیسائی مذہب سے متعلق سوالوں کے جواب دینے پر انہیں انعام دیا جاتا تھا۔[1]

لڑکیوں کے سکول قائم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی' کیونکہ انسپکٹرز یہ سمجھتے تھے کہ جتنے زیادہ سکول ہوں گے ان کی اتنی نیک نامی ہوگی جس کے لیے وہ جائز اور ناجائز حربے بھی استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے جبکہ ہندوستانی یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مقصد ''پردہ'' ختم کرانا ہے۔

۱۸۵۵ء میں پادری اے۔ ایڈمنڈ نے ایک چٹھی جاری کی جس میں کہا گیا تھا کہ ''اب ہندوستان میں ایک عملداری ہوگی' تار برقی سے سب جگہ خبر ایک ہوگی' ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگی' مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب

[1] اسباب بغاوت ہند از سرسید احمد خان بحوالہ پاکستان ناگریز تھا۔

ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''۔[2]

انگریزوں نے نئے کارتوس رائج کیے جن پر خوب موٹی چربی ہوتی تھی' دانت سے کاٹ فوجی اسے بندوق میں لگاتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہوا کہ یہ گائے اور سور کی چربی کے ہیں جن کی وجہ سے ہندو اور مسلمان اس سے متنفر ہو گئے۔

۱۸۵۷ء میں مختلف فوجی چھاؤنیوں میں شورش ہوئی' انگریزوں نے سپاہیوں کو مطمئن کرنے کے بجائے سختی سے دبایا۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی فوجیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ کیا۔ کئی انگریز آفیسر قتل کر دیئے گئے۔ یہ دہلی کی طرف بڑھے اور انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو سرپرستی کے لئے محل سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

دہلی' کانپور' لکھنؤ اور ان کے اطراف شورش و جنگ کے خاص مراکز ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ ہندو راجہ اور مرہٹے بھی اس جنگ میں شریک ہو گئے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے یہ جنگ بلا تیاری' بلا تنظیم اور بلا ساز و سامان شروع ہوئی' ورنہ ہندوستان میں مقامی فوج کے مقابلہ میں انگریزی فوج اتنی کم تھی کہ اگر تدبیر اور تنظیم سے کام لیا جاتا تو انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا مشکل نہ تھا۔

بعض علماء اور بعض سردار اس جنگ میں شریک ہوئے مگر اس طرح کہ نہ ان کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ دشمن کا۔ ایک ہنگامہ کے طور پر یہ جنگ شروع ہوئی اور ہنگامے ہی کے طور پر سرد ہو گئی۔[3]

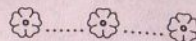
شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ دو جماعتوں نے آزادی کے حصول کا مقصد سامنے رکھا تھا۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی دوسری روہیلوں کی۔

یہ جنرل بخت خان کی سرداری میں داد شجاعت دے رہے تھے۔ ۱۹ ستمبر کو انگریز

[2] اسباب بغاوت ہند' ضمیمہ ۳' حیات جاوید' صفحہ ۹۰۲ بحوالہ پاکستان ناگریز تھا' صفحہ ۲۵

[3] پاکستان ناگریز تھا (صفحہ ۲۸)

دہلی پر مکمل طور پر قابض ہو گئے۔ جنرل بخت خان اپنی فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ جنرل بخت خان نے بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے۔ غرض آپس کی پھوٹ اور رقابت نے جنگ کے مثبت نتائج برآمد نہ ہونے دیئے۔[۴]



[۴] الثورۃ الہندیہ صفحہ ۱۵۷، بحوالہ نقش حیات حاشیہ صفحہ ۴۶، ۴۷

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور صحافت

برعظیم پاک و ہند میں صحافت، جدوجہد آزادی اور اجنبی راج کے خاتمہ کی کوششوں میں ہمیشہ ممد و معاون رہی ہے۔ ۱۸۰۰ء کا ذکر ہے، جنوبی ہند میں ایک شخص نے بڑے پیمانے پر قلمی اخبار تقسیم کیے۔

ان اخبارات میں برطانوی فوج کے دیسی سپاہیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں سے پرجوش اپیل کی گئی تھی کہ وہ جرأت اور جوانمردی سے کام لے کر فرنگیوں کے خلاف برسر پیکار ہو جائیں اور انہیں نیست و نابود کر کے دم لیں۔

۱۸۰۶ء میں ویلور کے مقام پر بغاوت ہوئی تو اس وقت بھی قلمی اخبارات نے اپنا پورا پورا کردار ادا کیا۔ سر جان میلکم کے مطابق "اس غدر میں قلمی اخبارات کا بڑا دخل تھا"۔

۱۸۳۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ "ہم پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو قلمی اخبارات اشتعال انگیزی پر اُتر آتے ہیں بالخصوص جنگ برما کے دوران میں تو بہ حد سے گزر گئے"۔

اسی سال گورنر جنرل کی کونسل کے رکن مسٹر میکالے نے ایک نوٹ میں لکھا کہ صرف دہلی سے ہر ہفتے ایک سو بیس (۱۲۰) قلمی اخبار بذریعہ ڈاک باہر بھیجے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے پر مطبوعہ دیسی اخبارات کی کل ہفتہ وار اشاعت تین سو (۳۰۰) تھی۔

انہوں نے بتایا کہ مطبوعہ دیسی اخبار تو پھر بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن قلمی

[۱] صحافت پاکستان و ہند میں صفحہ ۱۵۶

اخبار اکثر ہمیں اور ہمارے عمال کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہمارے قومی کردار اور اطوار پر طنزیہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ریورینڈ جے لانگ نے اپنی ۱۸۵۹ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ صوبہ جات شمال مغربی میں ۱۸۵۰ء میں صرف اٹھائیس (۲۸) اخبار شائع ہوتے تھے جن کی مجموعی تعداد ۱۴۹۷ تھی۔ ۱۸۵۳ء میں ان کی تعداد انتالیس (۳۹) ہو گئی اور مجموعی اشاعت ۱۸۳۹ تھی۔

اگلے سال تک انہی اخبارات کی اشاعت ۲۲۱۶ ہو گئی۔ بنگال کے دیسی اخبارات کی تعداد اشاعت ۱۸۵۷ء میں ۲۹۵۰ کے قریب تھی جبکہ پنجاب سے شائع ہونے والے اخبارات کی اشاعت ۵۰۰ سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ برطانوی قلمرو میں دیسی اخبارات کی مجموعی اشاعت چھ ہزار سے بھی کم تھی۔

دیسی مطبوعہ اخبارات میں صرف دو تین اخبارات ایسے تھے جو کھل کر حکومت پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس کے باوجود انگریزی اخبارات نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں ان پر پابندی کا مطالبہ کیا۔

مارچ ۵۷ء میں آگرہ کے ہفت روزہ انگریزی اخبار "The Mofussilite" نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دیسی اخباروں پر سنسر شپ نافذ کر دیا جائے۔ لاہور سے ''دی پنجابی'' کے نام سے جو انگریزی اخبار منشی محمد عظیم نے جاری کر رکھا تھا اور جس کی ادارت ایک انگریز کے سپرد تھی' اس نے ۲۸ مارچ ۱۸۵۷ء کے شمارے میں لکھا:

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سے دیسی اخبار ہماری فوج کے دیسی سپاہیوں میں تقسیم ہوتے ہیں ...... لیکن جب کوئی دیسی اخبار مذہبی جذبہ سے سرشار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت بدتر ہو جاتی ہے ...... ہم ایسا لکھنے پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ ہماری توجہ لکھنؤ کے ایک ایسے دیسی اخبار کی طرف دلائی گئی ہے جو ہماری فوج میں پڑھا جاتا ہے اور اس نے بیرک پور کے ہنگاموں کی خبریں اس انداز سے پیش کی ہیں جن سے شرارت کا امکان ہے''۔

اسی سال اپریل میں بنگال کے مشہور اور با اثر روزنامہ ''بنگال ہرکارو'' نے اس بنا پر دیسی صحافت پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کیا کہ بنگال' بمبئی اور مدارس کے دیسی سپاہیوں پر اس کا بڑا اثر تھا۔

۱۸۵۷ء میں جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا تو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کرنے کے لئے ہر چھاپہ خانہ کے لئے لائسنس لینا ضروری قرار دیا اور وہ صحافتی قانون نافذ کیا جسے تاریخ میں قانون زبان بندی (Gagging Act) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس طرح حکومت کو اختیار مل گیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کر دے اور جس اخبار کو چاہے اس پر سنسر شپ کی پابندی لگا دے۔ جس پر لاہور کرانیکل اپنے ۱۱ جولائی کے شمارے کے اداریئے میں لکھتا ہے:

''ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ بہت سے دیسی اخبار سازش اور بغاوت میں مصروف ہیں لیکن یہ دلیل بہت بودی ہے کہ دیسی صحافت یا اس کے ایک جزو کی بغاوت پر اینگلو انڈین صحافت کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے''۔

اسی طرح لاہور کے ''دی پنجابی'' نے اپنی ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں لکھا کہ:

''دیسی صحافت نے عوام میں مقبولیت کے لئے نہ اعتدال پسندی کو بنیاد بنایا نہ سچائی کو' اب اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے' کیوں کہ وہ زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ دی گئی ہے اور شرارت کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ ہم نے تو کبھی یہ پالیسی پسند نہیں کی کہ ان اخبارات کو آزادی دے دی جائے جن کے چلانے والے اپنی عظیم جہالت کی وجہ سے زمانے بھر میں رسوا ہیں اور پرلے درجے کے ناشکرے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آج کی لگائی ہوئی پابندی کبھی نہ اٹھائی جائے گی۔ کم از کم یہ ایک سو سال تک ضرور قائم

رہے گی"۔

Gagging Act کے تحت بہت سے اخبارات کے خلاف کارروائی کی گئی۔

"بنگال ہرکارو" جس کی ملکیت دوار کاناتھ ٹیگور کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھی اپنا لائسنس کھو بیٹھا۔ سیرام پور کے اخبار "فرینڈ آف انڈیا" کو پلاسی کی صد سالہ برسی کے عنوان سے ایک خطرناک اور اشتعال انگیز مضمون چھاپنے پر انتباہ کیا گیا۔ اس نے انتہاء پر ناراضگی کا اظہار ترشی سے کیا تو اسے لائسنس کے ضبط کرنے کی دھمکی دی گئی۔

کلکتہ کے انگریزی اخبار "The Hindu Intelligencer" کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا۔ کلکتہ کے ہی تین اور اخبار "دوربین" "سلطان الاخبار" اور "ساچار پرشن" بھی اس قانون کی زد میں آگئے کیونکہ انہوں نے مغل حکمران کا شاہی فرمان ایک معاصر انگریزی اخبار سے ترجمہ کر کے چھاپا۔ جس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیں اور اس فرمان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔

کلکتہ ہی کے ایک فارسی اخبار "گلشن نوبہار" نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کے شمارے میں دو شدید باغیانہ نوعیت کے مضمون چھاپے جس کا مقصد برطانوی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا اور ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرنا تھا جو حکام کی مزاحمت کریں۔ اس کے اس اقدام پر پریس کا لائسنس منسوخ کر کے اس کی مشینری اور پریس پر قبضہ کر لیا گیا۔

اس کے برعکس انگریزی اخبارات کو مادر پدر آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کا رویہ ہندوستانی عوام کے خلاف معاندانہ اور اشتعال انگیز ہوتا تھا مگر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی تھی۔ اسی قسم کے ایک انگریزی اخبار "بنگال ہرکارو" نے ایک شخص کا مضمون چھاپا جس میں مطالبہ کیا گیا:

"ہر مسمار شدہ گرجے کے بدلے میں پچاس مسجدیں مسمار کی جائیں اور دہلی کی جامع مسجد سے اس مہم کا آغاز ہو اور ہر مقتول عیسائی مرد عورت اور بچے کے بدلے ایک ایک ہزار باغیوں کو گولی سے اڑا دیا جائے"۔

لاہور کرانیکل میں ایک مقالہ "خونیں انتقام اور صحیح پالیسی" کے عنوان سے چھپا جس میں لکھا گیا:

"دہلی کو مسمار کر کے زمین سے ملا دینا نہایت ضروری ہے۔ جب اس کے باشندے دور دراز کے صوبوں میں جائیں گے تو لوگوں سے اپنے شہر کی بربادی کا ذکر کریں گے۔ وہ بتائیں گے کہ دہلی کی گلیاں اور بازار انگریز عورتوں اور بچوں کے خون سے ناپاک ہوئی تھیں۔ اس لیے اس کے عالیشان اور خوبصورت محل اب مٹی کے تودے بن کر رہ گئے ہیں۔

اس عظیم الشان شہر کے کھنڈر ایک یادگار کی صورت اختیار کر لیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جن دیہات سے ہماری نعشیں برآمد ہوتی ہیں انہیں اس لیے برباد نہیں کیا جاتا کہ مالیہ وصول ہوتا رہے۔

اگر یہ صورت دہلی میں ہوئی تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں یہاں برابر آباد رہیں گے اور عظمت پارینہ کی یادگاروں کو دیکھ کر احیائے اسلام کی غرض سے پھر سازشوں میں مصروف ہو جائیں گے"۔ (لاہور کرانیکل ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء)

"دی پنجابی" اپنے ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کے شمارے میں ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے کہ:

"ہماری تجویز یہ ہے کہ جہاں آج دہلی واقع ہے وہاں ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا جائے۔ اس کے ساتھ وسیع بارکیں بنائیں جائیں۔ صدر بازار کے بارے میں فیصلہ کر لیا جائے کہ اس میں مقامی باشندوں کی ایک محدود تعداد آباد ہو سکے گی اور خیال رکھا جائے کہ اس کے قریب کوئی مقامی شہر آباد نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہماری تجویز یہ ہے کہ افسروں اور مقامی دستے کے فوجیوں کی سہولت کے لئے جامع مسجد کو گرجا بنا دیا جائے"۔

لاہور کرانیکل ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء ہی کے شمارے میں ایک اور افتتاحیہ لکھتا ہے:

''ہم پھر پکار کر کہتے ہیں کہ خونی انتقام لے لو' جس گاؤں میں ہمارے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز باشندے کی ذرا سی توہین ہوئی ہے اسے جلا کر راکھ کر دیا جائے' اس میں جتنے لوگ آباد ہیں انہیں برباد کر دیا جائے' کوئی بچنے نہ پائے۔ آج ہماری سنگین لہو سے سرخ ہونے دو' تا کہ آنے والے زمانے میں کسی انگریز عورت کے خون سے کسی قاتل کا چھرا آلودہ نہ ہو سکے''۔

انگریزی اخبارات کی اس مہم کا رخ خاص طور پر مسلمانوں کی طرف تھا۔ ایک نامہ نگار نے ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کے لاہور کرانیکل کے شمارے میں لکھا:

''اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہہ میں مسلمانوں کی سازش کارفرما ہے۔ انہیں شدید سزائیں دینی چاہئیں' کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے کو نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے''۔

اسی اخبار کا ایک مراسلہ نگار قرآن حکیم پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۱ نومبر ۱۸۵۷ء کے شمارے میں لکھتا ہے:

''مسلمانوں کی فطرت میں باغیانہ جذبہ ان کے توحیدی اور خراب مذہب کے اصولوں نے پیدا کر رکھا ہے۔ جب تک ہماری حکومت مسلمانوں کا مذہب برداشت کرے گی اس وقت تک دشمنی کا جذبہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ روز بروز بڑھے گا''۔

یہ صرف ''لاہور کرانیکل'' کی پالیسی نہ تھی بلکہ برعظیم کے طول و عرض سے نکلنے والے تقریباً تمام اینگلو انڈین اخباروں کی پالیسی تقریباً یہی تھی مگر حکومت نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ گویا تمام پابندیاں دیسی اخباروں کیلئے تھیں۔

آیئے اب دیکھیں جنگ آزادی کے دوران دہلی کے اخباروں نے کیا کردار کیا؟ خواجہ حسن نظامی نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی روداد پر مبنی جو کتابچہ ''غدر دہلی کے اخبار'' کے نام سے شائع کیا اس کے صفحے ۱۴۰ پر تحریر ہے کہ:

''جب حکیم احسن اللہ خان سے ''صادق الاخبار'' کے بارے میں دریافت کیا گیا

تو اس نے کہا' بہادر شاہ ''صادق الاخبار'' کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کرتا تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کے بعض اقتباس اس تک پہنچا دیئے جاتے ہوں۔ اس اخبار میں عام طور پر یہی بتایا جاتا تھا کہ ایرانی' انگریزوں کو شکست دے رہے ہیں۔ شہزادے اس کی خبروں کو اہمیت دیتے تھے اور ان کی صحت پر یقین رکھتے تھے۔

سر تھیوفلس مٹکاف (Theophilus Metcalf) کی رائے میں ان دنوں ہر دیسی اخبار کا ایک ایک نامہ نگار کابل میں متعین تھا۔ شمالی طاقتوں سے مواصلات کا سلسلہ مستقل طور پر قائم کیا تھا اور ہر ہفت روزہ اخبار میں ایران و انگلستان کی جنگ کی اطلاعات باقاعدہ چھپا کرتی تھیں۔[۲]

دہلی سے ایک قلمی اخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کا مدیر ایک شخص چونی نامی تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مجھے یاد ہے ''بعض مواقع پر میں نے کارتوسوں کے مسئلے اور اس پر فوج کے باغیانہ جذبے کی طرف بھی اشارے کیے۔'' ''صادق الاخبار'' دہلی سے نکلتا تھا اس کے مداحوں میں ہندو اور مسلمان بھی شامل تھے۔ اس اخبار میں ایران اور روس کے بارے میں جتنے مضامین چھپتے تھے ان کا انداز تحریر اور لہجہ انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی تھا۔[۳]

خواجہ حسن نظامی اپنے کتابچہ میں ''صادق الاخبار'' ''اردو اخبار'' اور ''خلاصۃ الاخبار'' سے لیے گئے اقتباسات میں تحریر کرتے ہیں:

''مقامی خبریں: ایران۔ کچھ دن ہوئے جامع مسجد کی ایک دیوار پر ایک اشتہار دیکھا گیا۔ اس کے اوپر تلوار اور ڈھال کی تصویر بنی ہوئی تھی' نیچے شاہ ایران کا مبینہ فرمان درج تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا۔ تمام مومنین کا فرض ہے کہ وہ شاہ ایران کی تائید و حمایت پر کمر باندھ لیں' اس کے حکم کی نہایت وفاداری سے اطاعت کریں اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں اس کی مدد کریں تا کہ

[۲] صحافت پاکستان و ہند میں صفحہ ۱۶۵
[۳] ایضاً' ۱۶۶

وہ انگریزوں کو جنگ میں ہرا کر برباد کر سکے اور عام لوگوں کو انعامات و خطابات سے بڑی فیاضی سے نوازے"۔

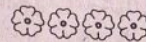
٦ جولائی اور ۳ اگست ۱۸۵۷ء کے "صادق الاخبار" سے جو اقتباسات فوجی عدالت میں پیش ہوئے ان میں درج تھا کہ "ایران میں ہندوستان پر حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کافروں کا ساتھ چھوڑ دے"۔

ایرانی فوج کی خبریں' کے عنوان سے ۲۳ اگست کے "دھلی اردو اخبار" میں یہ خبر دی گئی:

"پشاور اور پنجاب سے آنے والے کچھ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایرانی فوج اٹک تک پہنچ گئی ہے' میں نے یہ سنی سنائی بات صرف اس لیے درج کر دی ہے کہ اس کا امکان موجود ہے"۔

فوجی عدالت میں وکیل استغاثہ میجر ایف جے ھیریٹ (Harriot) نے اپنے طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب جن وجوہ کی بنا پر برپا ہوا اس میں قلعہ معلیٰ اور صحافت کے درمیان سازش بھی کارفرما تھی۔[۴]

اس انقلاب نے مسلمانوں کو عملاً صحافت سے بے دخل کر دیا کیونکہ انقلاب برپا ہوتے ہی شمال مغربی صوبہ جات کے زیادہ تر اردو اخبار بند ہو گئے۔ ۱۸۵۳ء میں اردو کے پینتیس (۳۵) اخبار شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں ان کی تعداد صرف بارہ (۱۲) رہ گئی جن میں سے صرف ایک اخبار کا ایڈیٹر ایک مسلمان تھا۔



[۴] صحافت پاکستان و ہند میں صفحہ ۱۴۹۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا ہندوستان

ہندوستان کے انقلابی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی' سرحد میں آزاد مسلم ریاست کے قیام کی کوششوں اور برطانوی فوجوں سے انقلابیوں کی براہ راست اور بالواسطہ جھڑپوں نے انگریزوں کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا تھا۔ مسلمان چونکہ ہندوستان کے سابق حاکم تھے اور صلیبی جنگوں کے دور سے ہی یورپی اقوام ان کو اپنا دشمن تصور کرتی تھیں اس لیے ان کے سات سو برس کے اثرات حکومت زائل کرنے کے لئے انگریزوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ ان سے اپنا پرانا حساب چکانے کے لئے تعصب انتقام میں ان کو خوب تباہ و برباد کیا۔

۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے تاج اور برطانوی پارلیمنٹ کی حکومت کے قیام کی سعی کی گئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلان کے ذریعے ہندوستان کے والیان ریاست' زمینداروں اور عوام کو تشفی دی اور یقین دلایا کہ مذہب کے معاملے میں حکومت برطانیہ غیر جانبداری اور رواداری سے کام لے گی اور سرکاری عہدوں پر عام مذہب و ملت کے لوگوں کو یکساں حق حاصل ہوگا بشرطیکہ ان میں اس کام کی لیاقت اور صلاحیت ہو۔

بنگال' مدراس اور بمبئی میں انگریزوں کا قیام طویل عرصہ سے تھا' انگریزی تعلیم بھی سب سے پہلے وہیں شروع ہوئی۔ ہندوؤں نے انگریزی تعلیم کو اشتیاق سے قبول کیا اور پارلیمانی طرز حکومت اور اس کے سیاسی نظام کو سمجھا۔ بعد ازاں انہوں نے حکومت برطانیہ کی خدمت میں یہ درخواستیں بھی پیش کرنا شروع کر دیں کہ ہندوستان میں انتخابی

اور نیابتی ادارے قائم کیے جائیں۔

مسلمان ۱۸۵۷ء کے واقعے کے سبب انگریزوں کے قہر وعتاب کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی تھی کہ وہ بھی ہندوؤں کی طرح اس طرف توجہ دیں۔ ویسے بھی ہندوستان میں صرف انہی کو پامال کیا گیا تھا۔

ان حالات میں علی گڑھ کے سرسید احمد خان نے کوشش کی کہ مسلمان بھی انگریزی تعلیم حاصل کر کے نئے حالات میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں تاکہ انگریزوں کی بدگمانیاں دور کی جا سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کیا۔

مسٹر آکٹیوین ہیوم (Mr. Octavian Hume) ایک برطانوی عہدہ دار نے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) اور دیگر ممتاز انگریزوں سے مشورہ کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی اور اس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد کیا۔

ایک عرصہ دراز تک کانگریس کا نظام انگریز چلاتے رہے اور ہندو ان کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے رہے تاکہ وہ ہندوستان میں پارلیمانی طرز حکومت قائم کر دیں۔ بظاہر یہ بڑی روشن خیالی کی باتیں تھیں مگر دراصل ہندوؤں کی طرف سے یہ انگریزوں کے زیر سایہ مسلمانوں کو غلام بنائے رکھنے کی ایک گہری سازش تھی۔

انہوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ چند مسلمان بھی کانگریس میں شامل ہو جائیں تاکہ وہ کانگریس کو ہندوستانیوں کی واحد جماعت کے طور پر پیش کر سکیں۔ فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دے تاسی جنہوں نے اردو زبان کی تحقیق پر اپنی ایک عمر صرف کی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر اس امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے''۔ لہٰذا ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں

۱؎ مولانا الطاف حسین حالی' حیات جاوید' صفحہ ۱۹۷

کے خلاف جو عناد تھا اسی کے تحت انہوں نے کانگریس مسلمانوں سے مشورے کے بغیر قائم کی اور جب وہ اپنے انتشار اور فساد کی منزل کی طرف چل پڑی تو انہوں نے اس میں مسلمانوں کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی۔

مارکوئیس آف لینسڈاون (Mr. Marquis of Lansdowne) وائسرائے کے دور میں ہندوستانی کونسلوں کے لئے ۱۸۹۲ء میں ایک آئین منظور کیا گیا۔ اس آئین کے تحت ۱۸۹۳ء میں انتخابات ہوئے جن میں مسلمانوں کو انہی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا جن کا منہ انہیں میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کے انتخابات میں دیکھنا پڑا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی۔ ۱۹۰۵ء میں انتظامی مشکلات کے سبب بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہندوؤں نے اس پر سخت شورش کی اور کانگریس نے ہندوستان گیر ایجی ٹیشن کیا کیونکہ تقسیم بنگال سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں ایک اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم لیگ کے بانی اور اس تنظیم میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں نواب محسن الملک' نواب وقار الملک اور مولانا محمد علی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

مسلم لیگ نے اپنی کم عمری کے باوجود منٹو مارلے اسکیم کے سلسلہ میں بڑی کامیابی حاصل کی مگر وہ تنسیخ بنگال کو نہ روک سکی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی کے دربار میں انگلستان کے شہنشاہ نے تنسیخ بنگال کا اعلان کر دیا اور اس طرح انگریز ہندوستان میں ہندوؤں کے ایجی ٹیشن سے مرعوب ہو گئے۔ ہندوستان کی سیاست پر کانگریس اور مسلمانوں پر انگریزی تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔

عالمی سیاست کے نقشہ پر مسلمانوں کی ریاست سکڑتی جا رہی تھی۔ طرابلس میں مسلمان ابھی اٹلی سے برسرپیکار ہی تھے کہ بلقان کی ریاستوں نے متحدہ طور پر ترکی پر

حملہ کر دیا۔ اس حملے کا واضح مقصد ترکی اور اسلام کو یورپ سے نکال باہر کرنا تھا۔

برطانیہ ان سازشوں میں برابر کا شریک تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی تائید میں ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ اس کے تصور سے دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام ملک سے چندے اکٹھے ہوئے اور ترکوں کو مالی امداد روانہ کی گئی۔[۲] خود مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد کا انتظام کیا جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں بلقان گیا۔

ہندوستان میں مسلمان آزادی کی آئینی جنگ میں مشغول تھے تو سرحد کے علاقے میں شاہ ولی اللہؒ مجدد دہلوی' سید احمد شہیدؒ اور مولانا ولایت علی کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی کی مسلح جدوجہد میں مصروف تھے۔ مولانا عبدالکریمؒ ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء کو اسمست[۳] کے مقام پر وفات پا گئے۔ ان کے بعد نعمت اللہ نبیرہ' مولانا عبداللہ اور ۴ مئی ۱۹۲۱ء میں ان کی شہادت کے بعد مولانا عبداللہ کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی منصب امارت پر فائز ہوئے۔[۴]

انیسویں صدی کے اختتام پر مولانا عبداللہ کے دور امارت میں برطانوی سامراج نے سرحد کے علاقے میں انقلابی مجاہدین کے ٹھکانوں کو ختم کرنے کے لئے ان علاقوں میں فوجی چوکیاں قائم کرنے اور پکی سڑکیں بنا کر ذرائع نقل و حرکت آسان بنانے کے لئے ایک منصوبہ پر عمل شروع کیا مگر بعد ازاں ہندوستاں کے بدلتے ہوئے حالات کے سبب وہ اپنے اس منصوبہ پر عمل نہ کر سکے۔



---

۲ پاکستان ناگزیر تھا (صفحہ ۸۸)

۳ سرگزشت مجاہدین (صفحہ ۴۹۹)

۴ ایضاً (صفحہ ۵۰)

تحریک ریشمی رومال

ریشمی رومال کی تحریک برعظیم پاک و ہند میں برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی ایک انقلابی تحریک تھی۔ یہ تحریک سرحد میں انگریزوں کے خلاف تقریباً ایک صدی سے لڑی جانے والی جنگ' جس کا آغاز حضرت سید احمد شہید نے کیا تھا' کے سلسلے کی ہی ایک اہم کڑی تھی۔

جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے بعض معلومات دوسروں تک پہنچانے کے لئے کپڑے کے رومالوں پر تحریر کی گئی تھیں۔ برعظیم پاک و ہند کے سرفروش حریت پسندوں نے ملک کو برطانوی عفریت سے نجات دلانے کے لیے اپنے تن' دھن من کی بازی لگا دی۔ خاک و خون میں تڑپے اور اپنے پیچھے بعض ایسی انمٹ داستانیں چھوڑ گئے' جن کے نقوش صفحہ تاریخ پر ہمیشہ کے لیے کندہ ہو کر رہ گئے۔

ہندوستان کے عوام' مسلمانوں اور خصوصاً علماء کرام نے اس تحریک میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والوں کی رہنمائی کا کام سرانجام دیا۔

یہ لوگ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے خاندان کے افراد' پیروکار اور رفقاء نے اپنے مقدس خون سے تحریک آزادی کی پھلواری کی آبیاری کی اور انہوں نے بلاتمیز شاہ ولی اللہؒ کے عظیم مشن کو آگے بڑھایا۔

حصول مقاصد کے لیے انہیں جن امتحانات اور مصائب سے گزرنا پڑا' وہ تاریخ

کی تلخ ترین مگر مبنی بر حقائق صداقتیں ہیں، جن سے قطعی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ یہ تحریک برطانوی سامراج کے خلاف تھی اس وجہ سے برطانوی حکومت نے اس تحریک کو ریشمی رومال کی سازش کا نام دیا۔

برطانوی سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے مطابق ریشمی کپڑوں کے ٹکڑوں پر یہ خطوط مولانا عبید اللہ سندھی نے تحریر کیے تھے۔ اس لیے انہیں اس سازش (تحریک) کا بانی اور دیگر اکابر کو ان کا معاون و شریک کار قرار دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے حکم پر ایک منصوبہ کے تحت کابل کا سفر کیا۔ اس منصوبہ اور تحریک کے سربراہ (شیخ الہند) مولانا محمود حسن تھے اس لیے انہی کو تحریک کا بانی کہا جانا چاہیے۔

البتہ اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ریشمی رومال میں جو معلومات، مشورے، ہدایات اور تفصیلات نیز جنود ربانیہ اور حکومت موقتہ کے بارے میں جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا اس کے خالق مولانا عبید اللہ سندھی ہی تھے، اس وجہ سے انگریزوں کا مولانا سندھی کو اس تحریک کا بانی قرار دینا غلط معلوم نہیں ہوتا۔

یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین مختلف ٹکڑوں پر تحریر کیے گئے تھے۔ یہ پہلا خط ۱۰×۸ انچ طول وعرض کا تھا۔ یہ خط ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام سے تحریر کیا گیا تھا۔

دوسرا خط شیخ عبد الرحیم سندھی کے نام لکھا گیا تھا، جو ۶×۵ انچ کے طول وعرض پر محیط تھا۔ یہ خط پہلے خط کے ایک دن بعد ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا تھا۔ آپ سندھ کے مشہور عامل خاندان کے ایک فرد تھے۔ حیدر آباد (سندھ) کے محلہ گاڑی احاطہ میں رہتے تھے۔ آپ کے والد کا نام بھگوان داس تھا۔ ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما کے "بی اچاریہ کرپلانی" آپ کے چھوٹے بھائی تھے۔

شیخ عبد الرحیم اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ دین کی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ کی محنت کے سبب سندھ کے

بہت سے بااثر ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

آپ نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مردانہ وار حصہ لیا۔ تحریک شیخ الہند کے سرگرم اور اہم رکن تھے۔ آزادی کی جدوجہد میں بے پناہ قربانیاں دیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے انہیں ریشمی رومال سازش (تحریک) کا ایک اہم رکن اور ہندوستان، حجاز اور کابل میں موجود سازشیوں (حریت پسندوں) کے مابین رابطہ کا کام انجام دینے والا قرار دیا۔

جنود ربانیہ میں انہیں کرنل کا عہدہ حاصل تھا۔ تحریک کے اختتام کے بعد جن انقلابیوں کی گرفتاری کا حکم ہوا، ان میں ایک نام آپ کا بھی تھا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے آپ روپوش ہو گئے۔

برطانوی سی آئی ڈی کو ان کے بارے میں اس قدر بھی علم نہ ہو سکا کہ آپ ملک کے اندر ہیں یا کابل جا چکے ہیں۔

اس سلسلہ کا تیسر خط ۱۵X۱۰ انچ طول وعرض کا تھا۔ یہ خط بھی مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام تحریر کیا گیا تھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ریشمی رومال پر تینوں تحریریں مولانا عبید اللہ سندھی کی ہیں، اگرچہ ایسا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی اس سبب ہوئی کہ ایک خط پر کسی کے دستخط موجود نہیں تھے۔ جبکہ باقی دونوں رومالوں پر مولانا سندھی کے دستخط موجود ہونے کی وجہ سے تیسرا خط بھی ان سے موسوم کیا گیا۔

دراصل ایک خط مولانا محمد میاں کا تحریر کردہ تھا۔ خط کا ایک ایک لفظ اور جملہ اس حقیقت کا غماز ہے۔ مولانا محمد میاں جب حجاز سے غالب نامہ اور دوسری تجویزیں لے کر ہندوستان آ رہے تھے تو مولانا شیخ الہند نے انہیں جدہ میں الوداع کہا تھا۔ یہی وجہ ہے مکتوب نگار نے جدہ کے بعد کے واقعات اس خط میں رقم کئے ہیں۔ مکتوب نگار نے جدہ کے بعد کا حال اس طرح لکھا ہے "بمبئی بہ آرام و بے خطر پہنچے"۔

بعد ازاں مکتوب نگار نے راندیر میں مولوی محمد حسین سے ملاقات کی۔ محمد میاں

راندیر سے بھوپال گئے اور وہاں محی الدین قاضی سے ملاقات کی۔ انہوں نے مولانا حسرت موہانی، اور مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنی ملاقات اور کابل کے سفر وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا ناظم یعنی عبید اللہ سندھی کا ذکر صیغہ واحد میں کیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس خط کے لکھنے والے مولانا سندھی کی بجائے اور کوئی ہے اور یہ شخصیت صرف مولانا محمد میاں عرف محمد منصور انصاری کی ہو سکتی ہے۔



تحریک ریشمی رومال کے بانی

مولانا عبید اللہ سندھی، جنہیں سی آئی ڈی نے تحریک ریشمی رومال کا بانی قرار دیا ہے، وہ اس تحریک کے گنتی کے چند سرکردہ دماغوں میں سے ایک تھے۔ اس لیے انہیں تحریک کا بانی کہنا مناسب ہے۔

خود مولانا عبید اللہ سندھی نے اس سلسلے میں کیا فرمایا ہے؟ آیئے اس سلسلہ میں ہم ان کی ذاتی ڈائری سے استفادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں جو کچھ لکھا، اس سے چند فقرے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔[1]

''حضرت شیخ الہند نے ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ چار سال تک جمعیت الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا''۔

۱۳۳۱ھ ۱۹۱۴ء میں ''نظارۃ المعارف'' قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی کی ذاتی ڈائری، بحوالہ نقش حیات جلد دوئم صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۶، تحریک شیخ الہند محمود حسن

حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ وہ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے وہ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال میں مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔[2]

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا اس لیے میری طبیعت ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی مگر تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے اس کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔[3]

مولانا عبید اللہ سندھی کے ان بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال کے بانی وہ نہیں تھے بلکہ وہ اس تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ شیخ الہند محمود حسن بھی ہندوستان میں اس تحریک کے نمائندے اور سرکردہ تھے۔

دراصل اس تحریک کی بنیاد علماء صادق پور نے جو شیخ الہندؒ کے مرشد و شیخ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی و حضرت رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے مریدوں میں تھے۔ مولانا

---

۲ ایضاً

۳ کابل میں سات سال صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵ شائع کردہ ہند ساگر اکادمی لاہور و ماہنامہ الرشید لاہور دار العلوم دیوبند نمبر صفحہ ۲۹۴۔

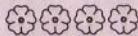
عبید اللہ سندھی کی کابل روانگی سے پچاس سال قبل تقریباً ۱۸۶۵ء رکھی تھی۔[4]

مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب سرگزشت مجاہدین کے صفحہ ۵۵۲ پر رقمطراز ہیں:

"میرے مطالعہ اور غور و فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز میں ایک نقشہ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباس پہنانے کی کوشش انہوں نے اس وقت شروع کر دی تھی جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں"۔

ملک کے حالات کسی تیز تحریک کیلئے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی۔ وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریقہ عمل پر گامزن ہوں؟

ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے جن کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکے اور جو پیش نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دار العلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتی الامکان محفوظ رکھیں۔



---

۴ علماء صادق پور (شاندار ماضی) جلد ۳ از صفحہ ۱۲۳ سے ۱۵۶ تک، سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۷۱ سے ۴۳۶ تک۔

تحریک کے مقاصد

مولانا محمود حسن، شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال، آزادی کے حصول اور برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی نئی جدوجہد نہ تھی بلکہ ملوکیت، شہنشاہیت اور برطانوی امپریلزم کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کی ایک اہم کڑی تھی۔

اس سے پہلے کی سطور میں مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے تحریر کیا جاچکا ہے کہ انہیں کابل جاکر معلوم ہوا کہ شیخ الہند جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل ان کے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے اور اسے شیخ الہند کے ان جیسے ایک خادم کی اشد ضرورت ہے۔

بلاشبہ مولانا محمود حسن نے مولانا عبید اللہ سندھی کو شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کے دوسرے اور تیسرے دور کو منظم اور مضبوط کرنے کیلئے کابل روانہ کیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کے تحت قائم کیے جانے والے ایک نئے نظام اور معاشرہ کی تشکیل کے دوسرے مرحلہ پر علماء صادق پور نے جو کردار ادا کیا ہے اسے مختصراً بیان کردیا جائے۔

مولانا سید نصیر الدین دہلویؒ کے انتقال کے بعد جماعت مجاہدین ایک مرتبہ پھر انتشار اور اضمحلال کا شکار ہوگئی مگر جلد ہی ان حریت پسندوں کی رہنمائی کے لئے علماء صادق پور سینوں میں شوق شہادت لیے ہوئے آگے بڑھے۔

علما صادق پور نے اپنا دائرہ عمل شمال مغربی علاقہ ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ وہ پشاور اور درہ خیبر سے لے کر بہار اور بنگال تک پھیل گئے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ ۱۷ شوال

۱۲۶۲ھ بمطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء کو بالاکوٹ کے مقام پر نئی قیادت کے ذریعے آزادی کے متوالوں کی رہنمائی کا کام سرانجام دیا۔ علما صادق پور میں مولانا ولایت علی چونسٹھ سال کی عمر میں اکتوبر ۱۸۵۲ء کو وفات پا گئے۔ انہیں ستھانہ میں دفن کیا گیا۔

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین مولانا عنایت علی بھی عرصہ چھ سال اور بعد ۱۸۵۸ء میں بعارضہ بخار انتقال کر گئے۔ بعدازاں صرف چار سال کے مختصر عرصہ میں ان کے دو جانشین مولانا نوراللہ اور میر مقصود علی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے مگر اس کے باوجود جماعت مجاہدین بڑی شان اور عزم سے علم جہاد بلند کیے رہی۔ مجاہدین کی اس جماعت کا تذکرہ ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر جس افسوس اور حسرت کے ساتھ کرتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''میں ان بے عزتیوں' حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۷ء میں سرحدی جنگ کے باعث ہوئے۔ اس دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔

ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی۔ اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔[1] بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں''۔[2]

میر مقصود علی کے انتقال کے بعد مولانا عبداللہ صادق پوری فرزند اکبر مولانا ولایت علی کو جماعت مجاہدین کی کمان سنبھالنا پڑی۔ آپ نے تقریباً چالیس (۴۰) سال

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان (صفحہ ۳۷ تا ۴۰)

[2] ہمارے ہندوستانی مسلمان (صفحہ ۵۸، ۵۹)

تک انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیے رکھا۔ آپ کے دور امارت میں انگریزی فوج کے جوانوں کو بار بار خاک و خون میں لوٹنا پڑا۔

مولانا عبداللہ صادق پوری سے خط و کتابت و روابط کے جرم میں ہزاروں محبان وطن کو گرفتار کر کے دریائے شور بھیج دیا گیا۔ عرصہ دراز تک شمالی ہند میں خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا اور یکے بعد دیگرے حریت پسندوں پر بغاوت و سازش کے الزامات کے تحت مقدمات چلائے گئے۔

علما صادق پور نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشن کی تکمیل کے لئے لاکھوں روپے کی منقولہ و غیر منقولہ جائیدادوں کو راہ جہاد میں داؤ پر لگا دیا۔ شاہانہ اور عیش و عشرت کی زندگی کے بجائے افلاس' فقر و فاقہ اور جفاکشانہ طرز زندگی کو فوقیت دی۔ بعض اوقات درختوں کے پتے' کونپلیں اور پودوں کی جڑوں کو غذا کے طور پر استعمال کیا اور خود کو اپنے وطن عظیم آباد عرف پٹنہ سے سینکڑوں میل دور علاقہ شمال مغربی جنوبی سرحد کے علاقے میں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے قربان کر دیا۔

اس قربان گاہ تک پہنچنے کے لئے حریت پسندوں نے غیر معمولی نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں بنگالی بطل حریت دو ہزار میل سے زائد مسافت طے کر کے شمال مغربی سرحد کی قربان گاہ تک پہنچے اور داد شجاعت دیتے ہوئے اپنی جانوں سے گزر گئے۔

بقول ولیم ولسن ہنٹر:

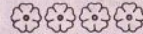
''بنگالیوں کے حملے ایسے ہوتے گویا بھوکے شیر شکاروں پر جھپٹ رہے ہیں' اس طویل مسافت پر رسد اور سامان جنگ پہنچانے کے لئے ایسا خفیہ نظم و ضبط قائم کیا کہ جب تک تحریک کامیابی سے چلتی رہی یعنی ۱۸۳۶ء سے تقریباً ۱۸۶۲ء تک انگریزوں کی سی آئی ڈی ان کے خفیہ نظام کار سے واقف نہ ہو سکی۔

اس کی سراغ رسانی کی دراز دستی نہ ہی مرکز کو چھو سکی اور نہ کسی قافلہ کی گرفت

کر سکی اور نہ زر رسانی کے ذرائع اس کو معلوم ہو سکے اور نہ رسل و رسائل کے طریقوں کا پتہ چلا سکی''۔

اس تحریک کا محرک و مقصد صرف ایک ہی تھا اور وہ مقصد تھا تجارتی مقاصد کے تحت آنے والے برطانوی سامراج اور توسیع پسندوں کو جو اس وقت ہندوستان پر چھا رہے تھے، کسی نہ کسی طرح انہیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔

وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات و نظریات کی روشنی میں ایک ایسی اسلامی اور فلاحی ریاست، نظام اور معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے جو پرانے اور فرسودہ نظام کو پاش پاش کر سکے۔



شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن

۱۹۱۵ء کا ذکر ہے کہ سرحد میں مسلمان سرفروش، انگریزوں کے خلاف داد شجاعت دے رہے تھے۔ ان کی جہاد سے متعلق خبریں ہندوستان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کو متواتر مل رہی تھیں۔ انہی دنوں آپ کو انقلابی مسلمانوں کا پیغام ملتا ہے کہ ہم رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں۔ جب تک ان کا انتظام نہیں ہو جاتا ہم انگریزوں کا مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔

ہمارے پاس حریت پسندوں کی کمی نہیں ہے مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ساتھ لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہدوں کو اپنے گاؤں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوس کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے۔ اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں، مشین گنوں اور ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لیے تیار کیجئے۔[1]

اس اطلاع کے ملنے پر مولانا محمود حسن نے غالباً سرحد کے غازیوں کے ساتھ مل کر جہاد جاری رکھنے کا ارادہ بدلا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجنے اور خود استنبول جانے کا مصمم ارادہ کیا۔ آپ نے اپنے اس ارادہ سے رفقا کو آگاہ کیا تو انہوں نے بھی اس بات پر زور دیا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔ چنانچہ آپ نے حجاز جانے کا پروگرام مرتب کیا۔

---

[1] نقش حیات جلد دوئم صفحہ ۲۱۲ و تحریک شیخ الہند صفحہ ۱۲۰۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن ۵۲'۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی کا تعلق قصبہ دیو بند ضلع سہارنپور کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز اور ذی وجاہت گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد جو محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے ایک عرصہ سے بریلی میں مقیم تھے۔ انہیں علوم عربیہ خصوصاً ادبیات عربیہ و فارسیہ اور اردو میں مہارت حاصل تھی اور وہ کئی کتب کے مصنف بھی تھے۔

مولانا محمود حسن کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی کہ ان کا تبادلہ ۱۸۵۷ء کے واقعے سے قبل میرٹھ ہو گیا اس لیے آپ جنگ آزادی کے دوران کبھی میرٹھ اور کبھی دیو بند رہے۔ مولانا محمود حسن نے قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم ایک نہایت دیندار بزرگ میاں جی منگلوری سے پائی اور کتب عربیہ کا علم اپنے چچا مہتاب علی سے حاصل کیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیو بند میں مدرسہ عربیہ قائم کیا تو آپ ان کے پہلے طالب علموں میں سے تھے۔ ان سے آپ نے صحاح ستہ اور دیگر علوم کی اعلیٰ کتب پڑھ کر فیوض و برکات حاصل کیں' جبکہ بعض کتب اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔

فراغت تحصیل سے قبل ہی مدرسہ میں معین المدرسین درس دینا شروع کر دیا۔ بائیس سال کی عمر میں مولانا محمود حسن کو علما حقانی کے ہاتھوں دستار فضیلت اور سند عطا ہوئی۔ دو سال بعد بزرگوں کی تجویز پر باقاعدہ مدرس چہارم مقرر ہوئے اور ہر قسم کی متوسط اور اعلیٰ کتب آپ کے زیر درس رہیں۔

چوبیس سال کی عمر میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ور شید گنگوہی' جنہوں نے تھانہ بھون اور شاملی کے جہاد میں انگریزوں کو نیچا دکھایا تھا' کی سرکردگی میں حج بیت اللہ اور زیارت حرم نبویؐ کے شوق میں روانہ ہوئے اور اپنے زمانے کے قطب العالم مولانا حاجی امداد اللہ صاحب سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ارشاد پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔

مقامات مقدسہ کی زیارت کے بعد بعافیت ملک واپس پہنچے اور بدستور درس و تدریس کے شغل میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں اپنی مشہور کتاب ''الایضاح الادلہ''

کے ابتدائی اجزاء تحریر فرمائے۔ اپنے استاد مولانا محمد قاسم نانوتوی جن سے آپ کو عشق کے درجے کا پیار تھا' کی وفات کے بعد تمام مشاغل ترک کر کے عزلت گزینی اختیار فرمائی۔

ایک ماہ بعد مولانا رفیع الدین مہتمم دار العلوم کے اصرار و ارشاد پر پھر تدریس کا کام شروع کیا اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ظاہرہ کی تدریس میں مشغول رہے۔ تھوڑے عرصہ بعد مقامات طریقت طے کر کے مستحق خلافت ہو گئے۔

چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے حسب عادت جناب حاجی امداد اللہ صاحب کو لکھا کہ مولوی محمود حسن کو ملکہ یادداشت حاصل ہو گیا ہے۔[2] آپ ان کو اجازت دے دیں' چنانچہ وہاں سے اجازت آ گئی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی وفات اور مولانا سید احمد دہلویؒ کے بھوپال چلے جانے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں باتفاق آرا آراکین' دار العلوم دیو بند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کے حلقہ درس میں مکہ معظمہ' مدینہ منورہ' موصل' بصرہ' بلخ' بخارا' ہرات' قندھار' کابل اور ترکستان کے طلبہ شامل رہے۔ جنہوں نے آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کے کلام میں خاص اثر تھا جس کے سبب آیات قرآنیہ اور احادیث نبوی کے معانی اور مضامین طلبہ کے دل و دماغ میں اتر جاتے تھے۔ جوانی کے زمانہ میں دن رات کے اکثر اوقات درس و تدریس کے شغل میں گزرتے جبکہ آخری ایام میں صرف دو تین گھنٹے روزانہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیتے تھے۔[3]

تواریخ عالم پر بالعموم اور تاریخ اسلام پر بالخصوص آپ کی گہری نظر تھی۔ اساتذہ کلام میں مرزا غالب سے بہت زیادہ مناسبت تھی' طبیعت نہایت سادہ اور متواضع تھی۔ غرور اور تکبر نام کو نہ تھا۔ آپؒ کی ظاہری وضع قطع اور چال ڈھال میں نمود' ریا اور بڑائی کا شائبہ تک نہ تھا جبکہ قدرت نے آپ کو پختہ عزم اور یقین صادق سے نوازا تھا۔

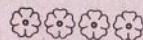
۲ نقش حیات (جلد دوئم صفحہ ۱۳۲)

۳ مختصر سوانح عمری حضرت شیخ الہند از مولانا سید اصغر حسین معہ افادات زائدہ (صفحہ ۱ اور ۲)

یوپی میں ناگرہ (۱۹۰۰ء) کے واقعہ' ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور مہاسبا' پھر سجد کانپور اور کلکتہ میں توہین جناب سرور کائنات' سردار دو عالم ﷺ کے فتنہ' ترکی کے ساتھ ناانصافی خصوصا طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے نتیجہ میں تقسیم ممالک اسلامیہ کے واقعات نے شیخ الہند' مولانا محمود حسن کے دل میں بے چینی پیدا کی اور ان کی نیند حرام کر دی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا حاجی امداد اللہؒ جیسے حریت پسند اور جید علماء کی صحبت نے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا' نیز شاملی اور تھانہ بھون پر انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا' مولانا محمود حسن کے سینے میں آزادی اور جہاد کی شمع روشن کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تمام زندگی انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔

مولانا محمود حسن چونکہ تقریباً پچاس سال تک درس و تدریس کے شغل میں مصروف رہے۔ اس لیے آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی جنہیں آپ نے اپنے ہم خیال بنا کر تحریک آزادی کے عظیم مشن میں شریک کیا۔ ان میں مولانا عبید اللہ سندھی سب سے نمایاں ہیں۔[۲]



[۲] نقش حیات جلد دوئم صفحہ ۱۳۷' حاشیہ

تحریک کا آغاز

شیخ الہند مولانا محمود حسن کا خیال درست تھا کہ انگریزوں کو طاقت کے سوا ہندوستان سے نکال باہر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ملک کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی نظریں سرحد کے انقلابی مسلمانوں پر لگی ہوئی تھیں جو آزاد قبائل میں آزادی کی ایک صدی پرانی جدوجہد کو اپنے خون سے فروزاں کیے ہوئے تھے۔

آپ نے انہیں نئے سرے سے منظم کرنے اور ان میں جہاد کی نئی روح پھونکنے کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا جس کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ ان علاقوں کے باشندوں کے درمیان موجود آپس کے پرانے جھگڑوں یا شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔ مجاہدین اور آزاد قبائل کے مابین اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین کے بچے کھچے لوگ جو ستیانہ اور چمرقند میں مقیم ہیں ان کے اور بعض قبائل کے درمیان موجود رنجشیں اور ناراضیاں دور کی جائیں۔

ان مقاصد کے پیش نظر مولانا سیف الرحمٰن کو دہلی سے' مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمد کو پشاور سے ان علاقوں میں بھیجا گیا۔ نیز مولانا محمد اکبر کو بھی اس کام پر آمادہ کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے بے شمار شاگرد اور مخلصین سرحد کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سب نے مل کر گاؤں گاؤں' قریہ قریہ اور قبیلہ قبیلہ میں گھوم پھر کر ان مقاصد کے لیے زمین ہموار کی۔

اس دوران ترکوں کو جنگ پر مجبور کر دیا گیا۔ اعلان جنگ کرنے پر ترکی پر آٹھ

مختلف محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق' عدن اور سوئز پر حملے شروع کر دیے اور روس نے بھی اسی طرح تین چار محاذ کھول دیے۔ ان حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تشویش بجا تھی۔

چنانچہ شیخ الہند نے حاجی ترنگ زئی کو ان واقعات سے مطلع کرتے ہوئے ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں۔ اس طرح آپ نے مرکز یاغستان کے مجاہدین کو بھی ہدایات تحریر کیں۔

جب حاجی ترنگ زئی مرکز یاغستان پہنچے تو مجاہدین کی ایک بڑی تعداد مجتمع ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ بعد سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے مجاہدین بھی وہاں پہنچ گئے۔ بالآخر انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی۔ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابیاں نصیب ہونے لگیں اور انگریزوں کو بے پناہ فوجی' جانی اور مالی نقصان برداشت کر کے پسپا ہونا پڑا۔

ان ناکامیوں کے بعد انگریزوں نے سہ رخی پالیسی اختیار کی' انہوں نے فوجوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر لشکر کشی کی' عوام میں پروپگنڈا کیا کہ یہ لوگ قطعی طور پر جہاد نہیں کر رہے کیونکہ بادشاہ کے بغیر جہاد نہیں ہوتا اور بادشاہ کی عدم موجودگی میں جہاد حرام ہے۔ اس کے علاوہ انقلابیوں کو قابو میں کرنے کے لئے انگریزوں نے پانی کی طرح مال و زر لٹایا اور قبائل کو خریدنے کی کوشش کی۔

ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ترکوں کو جنگ پر ہم نے مجبور نہیں کیا۔ یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں حالانکہ فتح بیت المقدس کے موقع پر وزیر اعظم انگلستان لارڈ جارج نے اپنے ایک بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔

انگریزوں نے مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ اور دیگر مذہبی مقامات پر بمباری نہیں کی جائے گی مگر کیا اس کے برعکس گیا۔

حجاز کو روانگی

سرحد میں انقلابیوں کی کامیابیوں سے برطانوی حکومت بوکھلائی ہوئی تھی اور معمولی

شبہ پر لوگوں کی گرفتاریاں کی جا رہی تھیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات ہندوستان میں اور سرحد (یاغستان) میں بڑی خطرناک تھیں۔ ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ حجاز روانگی سے قبل تحریک کی قیادت مولانا عبد الرحیم رام پوری کے سپرد ہوئی۔

اس سلسلہ میں تفصیلات مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں طے ہوئیں۔ جہاں شوال ۱۳۳۳ء کے پہلے ہفتہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بند سے مولانا عبد الرحیمؒ رائے پوری' رائے پور سے اور مولانا احمد رام پور سے تشریف لائے۔ چاروں حضرات مظاہر العلوم کے کتب خانہ میں اوپر تشریف لے جاتے اور سب طرف کے کواڑ اندر سے بند ہو جاتے تھے۔

پانچویں کا وہاں گزر نہ تھا۔ آپ حضرات چاء اور اشراق کی نماز کے بعد کتب خانے میں جمع ہو جاتے اور بمشکل نماز ظہر کی اذان سے پندرہ بیس منٹ قبل اوپر سے نیچے اترتے۔ کچھ گرم کچھ ٹھنڈا نوش فرما کر اور ظہر کی نماز پڑھ کر پھر کتب خانے میں پہنچ جاتے۔[1]

جب آپ نے رخت سفر باندھا تو حکومت کو شبہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا چونکہ حکومت ترکی جنگ میں شریک ہے لہٰذا شیخ الہند مولانا محمود حسن کہیں ان سے ساز باز نہ کر لیں اس لیے انہیں گرفتار کر لینا چاہیے۔ حکومت نے مولانا محمود حسن کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے' کوششیں جاری رہیں مگر آپ بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

اس زمانے میں مکہ معظمہ میں کئی ہندوستانی تاجر کاروبار کرتے تھے۔ ان میں دہلی کے حاجی علی جان معروف تھے۔ دین داری' علمی اور کاروباری لحاظ سے بھی وہ حکام اور مقامی لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے۔ اس خاندان کا سید احمد شہیدؒ اور مجاہدین ستیانہ سے قدیمی تعلقات تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن مکہ معظمہ پہنچے تو انہوں نے حافظ عبد الجبار جو اس خاندان

[1] مکتوب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا' ماہنامہ الرشید "دیو بند نمبر" صفحہ ۳۵!

میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے' سے ملاقات کی اور گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی درخواست کی۔

حافظ عبدالجبار نے شیخ الہندؒ کی مدد کے لئے ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر' جو تسبیحوں کی تجارت کرتا تھا اور عربی و ترکی زبان سے بخوبی واقف تھا' کا انتخاب کیا اور اسے مولانا محمود حسن کے ساتھ غالب پاشا سے ملاقات کے لئے روانہ کیا۔

آپ کی ملاقات گورنر حجاز سے ہوئی' نوجوان تاجر نے ترجمان (ٹرانسلیٹر Translator) کے فرائض انجام دیئے۔ غالب پاشا نے بغور آپ کی باتیں سنیں اور دوسرے دن دوبارہ ملاقات کا وقت دیا۔ شیخ الہند کی واپسی کے بعد غالب پاشا نے ہندوستان کے تاجروں سے مولانا محمود حسن کے بارے میں تحقیق کی۔

اگلے دن جب شیخ الہند مولانا محمود حسن ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو غالب پاشا بڑے اعزاز اور تپاک سے ملا۔ دیر تک تحریک آزادی اور مشن کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی۔ آپ نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو گورنر حجاز نے ایک تحریر گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی اور کہا کہ انہیں احترام اور اعزاز کے ساتھ استنبول انور پاشا کے پاس پہنچادو۔

غالب پاشا نے آپ سے ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن سے کہا کہ وہ ہندوستان کو مکمل آزادی کے لئے تیار کریں۔ عنقریب جب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور حلیف جرمنی اور آسٹریا' ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کریں گے۔[1] ایسا نہ کہ ہندوستانی رہنما انگریزوں کی ڈپلومیسی کے تحت ان کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔

تمام ہندوستان کو تقریروں' تحریروں کے ذریعے اندرون و بیرون ہندوستان ایک زبان اور یک قلم ہو کر یہ مطالبہ جاری رکھنا چاہیے۔

شیخ الہند نے غالب پاشا پر واضح کیا' اس وقت انگریز مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

۱؎ نقش حیات جلد دوم صفحہ ۲۱۴

اس میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لیے ہندوستان بھیجنے کو تیار ہوں۔ میں خود ہندوستان کی مغربی حدود سے جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کی لوگ تحریک آزادی میں مصروف ہیں۔ چند روز کے مختصر قیام کے دوران آپ نے غالب پاشا سے دو تین ملاقاتیں کیں۔ پھر غالب پاشا طائف اور آپ مدینہ منورہ کے روزانہ ہو گئے۔

آپ نے اپنے تمام ساتھیوں' مولانا مرتضیٰ' مولانا محمد میاں اور مولانا سہول کو مدینہ منورہ سے ہندوستان کے لیے روانہ کر دیا۔ اس دوران آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن کو دیوبند کے مرکز پر بعض امور کی نگرانی تفویض فرمائی اور مولانا محمد میاں کو غالب پاشا کی تحریر دے کر انہیں بھی بعض انتہائی اہم امور کی نگرانی پر مامور فرمایا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن' مدینہ منورہ سے استنبول جانے کی تیاری میں مصروف تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ انور پاشا اور جمال پاشا' (وزراء جنگ) مدینہ منورہ آ رہے ہیں۔

اس اطلاع کے ملنے پر شہریوں نے ان کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔

انور پاشا ان دنوں ترکی کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے ڈویژن کے کمانڈر۔

تمام محاذوں کا دورہ کرنے کے بعد وہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری کے لیے بذریعہ ٹرین جمعہ کے روز مدینہ منورہ پہنچے۔ اس دوران شیخ الہند کی انور پاشا سے ملاقات کا بندوبست کرا لیا گیا۔

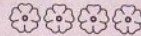
مقررہ وقت پر شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد ملاقات کے لیے ایک بند کمرے میں ملاقات کے دوران میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے غالب پاشا' گورنر حجاز کا خط ان کو دکھایا۔ جمال پاشا نے آپ کی باتیں اطمینان سے سنیں اور وہی بات دہرائی کہ تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور پر جاری رکھنا چاہیے۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی ہم اہل ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے اور ہر ممکن امداد کریں گے۔

آپ نے ایسی ہی تحریر ترکی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی طلب فرمائی تو جمال

پاشا نے کہا ''چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لیے ہم شام (دمشق) پہنچ کر تحریریں مکمل کر کے بھیج دیں گے''۔

مولانا محمود حسن نے مطالبہ کیا کہ انہیں حدود افغانستان تک بالا بالا پہنچا دیا جائے۔ ہندوستان کے راستے ان کا یاغستان (مرکز تحریک مجاہدین) پہنچنا غیر ممکن ہے۔

جمال پاشا نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور وہ سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یا تو آپ جدہ کے راستے سے ہی وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں جہاں چاہیں قیام کریں۔



مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے خاص فدائی، نو مسلم شاگرد اور تحریک ریشمی رومال کے ایک اہم ترین کردار تھے۔ عرصہ دراز تک اپنے استاد اور مرشد کی خدمت میں رہے۔ انتہائی سمجھدار، ہمت و استقلال کے پیکر اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔

آپ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں سیالکوٹ کے گاؤں چیانوالی کے ایک صراف (سنار) گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے تھے۔

آپ کے والد، آپ کی پیدائش سے چار ماہ قبل انتقال کر گئے۔ دو سال بعد دادا کے انتقال پر ان کی والدہ ننھیال چلی آئیں جن کا تعلق ایک سکھ خاندان سے تھا۔ تیسری جماعت کے طالب علم تھے کہ حقیقت کی جستجو میں ۱۸۸۴ء میں ''تحفۃ الہند'' پڑھی۔ بعد ازاں حضرت اسماعیل شہید کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' پڑھنے کو ملی تو توحید اور شرک کا علم ہوا۔ خود اپنے شوق سے نماز سیکھی اور ''تحفۃ الہند'' کے مصنف کے نام پر خود اپنا نام عبید اللہ تجویز کیا۔

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو گھر سے کوٹلہ مغلان کے عبد القادر نامی دوست کے ہمراہ نکلے اور کوٹلہ رحم پاشا ضلع مظفر گڑھ پہنچے۔ وہاں ختنہ کرائے اور بعض رشتہ داروں کے تعاقب کرنے پر سندھ کی طرف نکل گئے۔

عربی صرف کی کتب اپنے دوست سے دوران سفر پڑھیں اور حاجی محمد صدیق

(بھر چونڈی شریف سندھ والے) کی خدمت میں پہنچ گئے اور انہی سے قادری سلسلہ میں بیعت کر لی۔

اس دوران مولانا عبید اللہ نے اپنی تعلیم برابر جاری رکھی۔ ۱۸۸۹ء میں دیو بند پہنچے۔ دار العلوم میں داخل ہوئے اور تقریباً پانچ ماہ میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ سے پڑھے جبکہ شرح مولانا حکیم محمد حسن جامی سے پڑھی۔

حکمت اور منطق کی مزید کتب کے مطالعہ کے سلسلہ میں چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے پاس گزارے۔ وہاں سے مدرسہ عالیہ رام پور پہنچے۔ مولوی ناظر الدین کی خدمت میں رہے اور وہاں سے واپس دیو بند پہنچے۔ دو تین ماہ مولانا حافظ احمد سے علم حاصل کیا اور بعد ازاں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے درس میں شامل ہو گئے۔

۱۸۹۰ء میں ہدایہ' تلویح' مطول' شرح عقائد اور مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ جامع ترمذی مولانا محمود حسن سے پڑھی اور ابو داؤد کے لئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچے۔

اگلے سال اپنے مرشد سے ملاقات کے لئے بھر چونڈی شریف پہنچے۔ آپ کے مرشد آپ کے سندھ پہنچنے سے دس دن قبل انتقال فرما چکے تھے لہٰذا آپ ان کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود کے پاس امروٹ شریف (سکھر) چلے گئے۔

انہوں نے مولانا سندھی کا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسفزئی کی لڑکی سے کرا دیا۔ بعد ازاں آپ کی والدہ بھی سکھر پہنچ گئیں اور آخری دم تک مولانا سندھی کے ساتھ رہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۸۹۸ء میں دوبارہ دیو بند پہنچے' اپنے مطالعہ کا نمونہ حاصل دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گئے۔ جن میں سے ایک علم حدیث اور دوسرا فقہ حنفی سے متعلق تھا۔ مولانا محمود حسن نے انہیں بہت پسند فرمایا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ۱۹۰۹ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کو دیو بند طلب فرمایا۔ اور دیو بند میں کام کرنے کا حکم دیا۔ چار سال تک آپ جمعیت الانصار میں کام

کرتے رہے۔ اس کی تحریک و تاسیس میں مولانا محمد صادق سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور مولانا احمد علی سابق امیر انجمن خدام الدین آپ کے شریک رہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم پر کابل تشریف لے گئے۔ آپ کی ہجرت کا مقصد آزادی ہند کے سوا کچھ نہ تھا۔ سات سال تک کابل میں قیام کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی ماسکو تشریف لے گئے جہاں انہوں نے سات ماہ قیام کیا۔

ماسکو سے مولانا ترکی تشریف لے گئے' تین سال تک وہاں سکونت کیے رہے۔ بعد ازاں مکہ مکرمہ پہنچے جہاں آپ نے زندگی کے بارہ سال صرف کیے۔ اس طرح آپ تقریباً چوبیس پچیس سال کی زندگی جلاوطنی کی حالت میں گزار کر ۱۹۳۹ء میں واپس ہندوستان پہنچے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جس جوانمردی اور مستقل مزاجی سے بیرون ملک مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلیں' ملک کی آزادی' ملت اسلامیہ کی سرفرازی اور شاہ ولی اللہؒ کے انقلابی پروگرام کے عملی نفاذ کیلئے جو جدوجہد کی وہ انہی کا خاصا ہے۔

مولانا سندھیؒ نے کابل پہنچ کر جرمن مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کے متعلق صحیح صورتحال سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ دلائل کے ساتھ اپنی حکمت عملی کو تسلیم کرایا۔

راجہ مہند پرتاپ اور مولانا برکت اللہ جنہوں نے حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی تھی' ان میں ایک موقع پر جبکہ حکومت روس کے پاس ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو اس وفد میں ایک مسلمان کی شرکت پر اختلاف پیدا ہو گیا تو اس وقت مولانا اور بعض دیگر بزرگوں کی کوششوں سے یہ مسئلہ حل کر لیا گیا۔

اس دوران انہوں نے روسی مشن اور ترکی مشن میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اگرچہ موانع خارجیہ کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی بلکہ بعض ارکان کی کمزوریوں نے نقصان بھی پہنچایا۔

مولانا عبید اللہ سندھی' اگرچہ امیر حبیب اللہ (افغانستان کا بادشاہ) کو عملی طور پر جنگ

آزادی کے لئے آمادہ نہ کر سکے تاہم آپ کی شخصیت اور باتوں نے اس پر گہرا اثر کیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں اپنے قیام کے دوران عمومی طور پر اراکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنایا جس کے نتیجے میں روسی مشن کی واپسی پر امیر حبیب اللہ خان نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو سوائے سردار عنایت اللہ خان کے تمام لوگوں نے متفقہ طور پر انگریزوں کے خلاف لڑنے کے حق میں فیصلہ دیا۔

امیر حبیب اللہ خان شوریٰ کے اس فیصلے پر حیران رہ گیا اور اس نے آمرانہ طور پر اس فیصلے کو رد کر دیا۔

امیر حبیب اللہ کے جلال آباد میں قتل ہونے کے بعد امان اللہ خان امیر سلطنت بنے تو مولانا عبید اللہ اور ان کے بعض دوسرے ساتھیوں کی نظر بندی ختم ہوئی۔ نظر بندی کے خاتمے کے بعد آپ نے امیر امان اللہ خان سے ملاقات کی اور ہندوستان طرز کی تعلیم گاہ (مدرسہ) کھولنے کی اجازت مانگی۔ امیر امان اللہ خان نے اجازت دے دی مگر بعد ازاں برطانوی وزیر کے افغان وزیر خارجہ پر دباؤ کے تحت یہ اجازت منسوخ کر دی۔

مولانا عبید اللہؒ سندھی کی انقلابی شخصیت نے امیر امان اللہ خان کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے افغانستان کی کامل آزادی اور انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان پر انگریز حکمران سیخ پا ہو گئے۔

انگریزوں کے خلاف جنگ میں جنود اللہ (مولانا عبید اللہ سندھی کی جماعت) کے مخلص اور جانباز مجاہدین نے افغان فوج کا ساتھ دیا۔ بالآخر فتح افغانستان کی ہوئی اور انگریزوں کو افغانوں کی فتح تسلیم کرنا پڑی۔ اس پر سفیر برطانیہ نے کہا تھا کہ "یہ فتح دولت افغانیہ کی نہیں بلکہ عبید اللہ کی ہے"۔[1]

مولانا عبید اللہ سندھی نے اراکین جنود اللہ اور دیگر ہندوستان مسلمانوں سے جو اس وقت افغانستان میں مقیم تھے ایسے امور سر انجام دلوائے کہ افغانستان کی حکومت آپ کی شکر گزار تھی۔

---

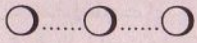
[1] نقش حیات (جلد دوئم صفحہ ۱۸۰)

آپ کی کوششوں سے امیر امان اللہ خان کے دور حکومت ۱۹۲۲ء میں کانگریس کمیٹی کابل بنائی گئی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے انڈین کانگریس سے کیا گیا اور آپ کابل میں اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔[2]

مولانا عبید اللہ سندھی ماسکو گئے تو نیشنل کانگریس سے تعلق کی بنا پر سوویٹ روس نے آپ کو بحیثیت مہمان ٹھہرایا۔ سات ماہ کے قیام کے دوران آپ نے اپنے دوستوں کی مدد سے سوشلزم کا مطالعہ کیا جیسا کہ وہاں آپ کو مطالعہ کی تمام سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

۱۹۲۳ء میں آپ ترکی گئے جہاں تین سال کے قیام کے دوران آپ نے تحریک اتحاد اسلامی کا تاریخی مطالعہ کیا اور یورپ کو اسلام سے متعارف کرانے کے لئے آپ نے اپنے استاد الاستاذ اور امام حضرت مولانا محمد قاسم دیوبندی کی خواہش کے عین مطابق پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرانے کے لئے اس وقت کی حکومت سے اجازت چاہی۔ ترکی وزارت خارجہ نے اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جبکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔

ترکی میں تین سال کے قیام کے بعد آپ مکہ مکرمہ چلے گئے جہاں آپ نے تقریباً بارہ سال قیام کیا۔ ہندوستان واپس پہنچنے کے تقریباً پانچ سال بعد انگریزوں کی ہندوستان سے بے دخلی سے چند سال قبل برعظیم انقلابی مسلمان ۲۱ اگست ۱۹۴۴ کو دین پور میں انتقال فرما گئے۔



---

[2] مولانا عبید اللہ سندھی کی ذاتی ڈائری (صفحہ ۲۰، ۲۱، ۲۲)

انور پاشا اور جمال پاشا کی تحریریں

مدینہ منورہ میں مختصر قیام کے بعد ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور ترکی کے چوتھے ڈویژن (فوج) کے کمانڈر جمال پاشا دمشق (شام) چلے گئے۔ دو تین دنوں کے بعد ترکی، عربی اور فارسی میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کے دستخطوں سے مزین تحریریں شیخ الہند مولانا محمود حسن کو بذریعہ گورنر مدینہ منورہ، پہنچا دی گئیں۔ تینوں خطوط کا مضمون ایک ہی تھا۔

ان خطوط میں ہندوستان کے مطالبہ آزادی کی قدر کرتے ہوئے مطالبہ سے ہمدردی ظاہر کی گئی تھی اور اس سلسلہ میں امداد و اعانت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ نیز ترکی کے شہریوں اور عوام سے کہا گیا تھا کہ مولانا محمود حسن (شیخ الہند) پر اعتماد کیا جائے اور ان کی اعانت کی جائے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن پر اس وقت صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ مرکز تحریک "یاغستان" پہنچ جائیں۔ اس کے برعکس ترکی کے امراء اور سرکاری حکام کی خواہش تھی کہ مولانا ترکی حدود سے باہر نہ جائیں اور یہیں سے تحریک کی نگرانی کریں۔ ان حالات میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے ساتھیوں کو ان خطوط سمیت ہندوستان روانہ کر دیں اور خود مکہ مکرمہ میں قیام فرمائیں۔

خطوط کو بحفاظت ہندوستان پہنچانے کے لئے ان تحریروں کے متعدد فوٹو لیے گئے تا کہ وہ تمام مراکز پر پہنچائے جا سکیں۔ ان خطوط کا انگریزی عملداری میں لے جانا چونکہ انتہائی مشکل کام تھا اور چیکنگ متوقع تھی اس لیے ان خطوط کو بحفاظت پہنچانے

کے لئے ایک خاص قسم کا صندوق بنایا گیا۔ صندوق جو جاوی لکڑی کا بنایا گیا تھا اس کے تختوں میں ان تحریروں کے لئے جگہ بنا کر اس مہارت سے جوڑ دیا گیا تھا کہ شبہ تک کی گنجائش نہ تھی۔

صندوق میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے کپڑے اور کچھ نئے ریشمی کپڑے کے تھان بچوں اور خواتین کے لئے رکھ دیئے گئے تھے۔ طے یہ پایا کہ مولانا خلیل احمد، مولانا ہادی حسن رئیس خان جہانپور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش سندھی اور ان کے رفقا کو بحری جہاز کے ذریعے ہندوستان کے لیے سوار کرا دیا جائے۔

پروگرام کے مطابق تحریروں والا صندوق ان حضرات کے حوالے کر دیا گیا اور طے پایا کہ ہندوستان پہنچ کر یہ خطوط حاجی نور الحسن رئیس موضع تھیڑی ضلع مظفر نگر کو پہنچا دیئے جائیں۔ وہ یہ خطوط دہلی میں احمد مرزا فوٹو گرافر کو پہنچائیں گے تا کہ ان کی مزید کاپیاں اور نقول بنوا کر طے شدہ مراکز پر پہنچائی جا سکیں۔

مولانا محمود حسن طائف سے مکہ مکرمہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ ان کے رفقا جہاز کی آمد کی اطلاع پا کر جدہ جا چکے ہیں۔ آپ نے انہیں رخصت کرنا ضروری سمجھا اور آپ بھی جدہ پہنچ گئے۔

جہاز کے بمبئی پہنچنے سے پہلے ہی برطانوی سی آئی ڈی کا عملہ اور مولانا محمود حسن کے مخلصین بندرگاہ پر پہنچے ہوئے تھے کیونکہ سب کا خیال تھا کہ شیخ الہند اس جہاز سے ہندوستان پہنچیں گے۔

اسی مجمع میں ایک صاحب نے جو شیخ الہند کے مخلصین میں سے تھے، مولانا ہادی حسن تک پہنچ کر ان سے کہا "اگر کوئی شے محفوظ رکھنا ہے تو فوراً مجھے دے دیں میں اسے یہاں سے نکال لے جاؤں گا اور جہاں انہیں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیں تا کہ مذکورہ پتہ پر پہنچا دی جائے"۔

مولانا ہادی حسن، اگرچہ ان سے واقف نہ تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے مولانا کو موصوف کی صداقت اور اخلاص کا یقین ہو گیا۔ اس لیے انہوں نے صندوق ان کے

حوالے کر کے ضروری ہدایات فراہم کر دیں۔

وہ صاحب عام مسافروں کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسن کا خصوصی صندوق قلی سے اٹھوا کر لے گئے اور اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ اس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کو صندوق اور خطوط کی ہوا بھی نہ لگ سکی۔

جہاز کی آمد پر پولیس اور سی آئی ڈی، شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تلاش میں رہے اور جب انہیں پختہ یقین ہو گیا کہ مولانا اس جہاز سے تشریف نہیں لائے بلکہ ان کے چند ساتھی آئے ہیں تب انہوں نے مولانا خلیل احمد اور مولانا ہادی حسن خان کو حراست میں لے لیا۔

تفتیش کے دوران ان سے کچھ برآمد نہ ہوا تو ان حضرات کو نینی تال پہنچا دیا گیا۔ مولانا خلیل احمد اور مولانا ہادی حسن کو دوران تفتیش بہت ڈرایا اور پریشان کیا گیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مولانا ہادی حسن خان بعد ازاں ڈیڑھ ماہ کے بعد حراست سے رہا کر دیئے گئے۔

حاجی شاہ بخش سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے جسے خیری برادران نے برلن سے جاری کیا تھا اور جو اعلانات ترکی سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان سب کو حاجی شاہ بخش سندھی نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ لیا تھا۔

جب جہاز پر انہوں نے پولیس کی یورش دیکھی تو اس بھیڑ میں وہ زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے۔ چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو شبہ نہیں ہوا مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا ہو گئے۔[1]

پولیس خطوط کی تلاش میں

مولانا محمد نبی کو معلوم ہو چکا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی شے پوشیدہ ہے۔ چنانچہ صندوق کے پہنچتے ہی انہوں نے اس میں سے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے اور اس صندوق کو توڑا گیا۔ اندازے کے مطابق صندوق کے ایک تختے

[1] نقش حیات (جلد دوئم صفحہ ۲۲۴) تراشہ دیکھئے

کے اندر سے محفوظ شدہ تینوں خطوط برآمد ہوئے۔ ان خطوط کو بلا تاخیر محفوظ کر لیا گیا۔

پولیس مولانا ہادی حسن اور مولانا خلیل احمد کے بیانات سے مطمئن نہ ہو سکی اور اپنے طور پر وہ معلومات حاصل کرتی رہی۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اسے صندوق کے بارے میں پتہ چل پایا۔ کسی شخص نے پولیس کو صندوق کے بارے میں مطلع کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ مذکورہ صندوق مولانا ہادی حسن کے مکان پر موجود ہے۔

اطلاع ملنے پر پولیس نے مولانا ہادی حسن کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت مولانا محمد نبی ان خطوط کی نقل کر رہے تھے۔ سپاہیوں کی نقل و حرکت دیکھ کر انہوں نے تینوں خطوط کھونٹی پر لٹکی ہوئی ایک صدری کی جیب میں رکھ دیئے۔ صبح دس بجے سے مکان کی تلاشی شروع ہوئی اور شام چار بجے تک جاری رہی۔

چھ گھنٹے کی مسلسل تلاشی کے باوجود پولیس مطلوبہ شے حاصل نہ کر سکی۔ اس دوران گھر کا کونہ کونہ، حصہ حصہ اور ایک ایک جگہ کی تلاشی لی گئی۔ کپڑوں کے صندوق توڑ دیئے گئے، بچوں کے کھلونے اور چیزیں برباد کر دی گئیں مگر مردانے میں ٹنگی ہوئی صدری پر کسی کی نظر نہ گئی۔

اس سرگرم اور شدید تفتیش کے باوجود، پولیس کو چین نہ تھا۔ یہاں سے پولیس، موضع رتھیڑی (ضلع مظفر نگر) پہنچی، جہاں مولانا حاجی نور الحسن رہتے تھے اور جن کے لئے شیخ الہند نے کہا تھا کہ وہ ان خطوط کی فوٹو کاپیاں بنوائیں گے، مگر ناکام و نامراد لوٹی۔

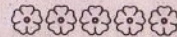
پولیس کو اطلاع ملی کہ بعض تحریریں، جن کی فوٹو کاپیاں حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر بنائیں گے ان کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اس پر پولیس نے دہلی میں حاجی احمد مرزا کی دکان پر چھاپہ مارا مگر اس وقت تک مذکورہ خطوط ان تک نہ پہنچے تھے۔ جب پولیس حاجی احمد مرزا کی دکان میں تحریریں تلاش کر رہی تھی عین اسی وقت حاجی نور الحسن احمد مرزا کی دکان کے قریب سے گزرے اور پولیس کو وہاں دیکھ کر واپس چلے آئے۔

حاجی نور الحسن دوبارہ حاجی احمد مرزا کی دکان پر پہنچے۔ تمام خطرات سے بے نیاز

ہو کر مرزا صاحب نے ان خطوط کے فوٹو بنائے۔ اس دوران پولیس دوبارہ دکان پر پہنچ گئی اس نے ساری دکان کھنگال ڈالی' ہر شے ٹٹولی مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہ گئی جس میں فوٹو رکھے ہوئے تھے۔ غرضیکہ پولیس کو ایک مرتبہ پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

خطوط کی تیار شدہ کاپیاں' حاجی نور الحسن نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ہدایت کے مطابق تمام متعلقہ لوگوں تک پہنچادیں۔ یہ تحریریں نہایت کار آمد ثابت ہوئیں کیونکہ حکومت ترکی اور اس کے حلیف مکمل طور پر مجاہدین کی حمایت و امداد کرتے مگر اچانک حالات تبدیل ہو کر رہ گئے۔ جرمنی اور ترکی کی کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف بن گیا اور مسٹر ولسن کے پر فریب نکات سامنے آئے تو یکایک صورت حالت بدل گئی اور فتح شکست میں بدل گئی۔

امریکہ کی بے شمار فوج اور لاتعداد ہتھیار اتحادیوں (انگریزوں) کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ دوسری جانب شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریزوں کی حمایت میں عربوں اور ترکوں کے درمیاں نفرت پھیلائی اور ترکوں کو نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ عرب' ترکوں کو قتل و غارت کرنے پر اتر آئے اور عربوں نے ترک فوج سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں ترکوں کی ناکامی لازمی تھی اور انگریز فوجیں ایران وغیرہ پر قابض ہو گئیں۔



غالب پاشا سے دوبارہ ملاقات

شیخ الہند' مولانا محمود حسن نے اپنے رفقا مولانا ہادی حسن خان اور مولانا خلیل احمد کو ہندوستان روانہ کرنے کے بعد مرکز تحریک (یاغستان) پہنچنے کا ارادہ کیا۔ انور پاشا اور جمال پاشا سے خطوط حاصل کرنے کے بعد آپ قدرے مطمئن تھے اور جلد از جلد یاغستان پہنچنا چاہتے تھے مگر روسی اور انگریزی افواج نے راستہ روک رکھا تھا اور جس راستے (ایران کی طرف سے) آپ سرحد کے علاقے تک پہنچنا چاہتے تھے ان پر انگریزوں کے جنگی محاذ قائم ہو چکے تھے۔

ان حالات میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے مناسب سمجھا کہ بحری راستہ سے سفر کیا جائے اور بمبئی کے بجائے بلوچستان کی کسی بندرگاہ (مکران) پہنچ کر وہاں سے بادبانی جہاز سے پہنچیں یا وہاں سے یاغستان کے لیے روانہ ہو جائیں۔ آپ کا بعض معاملات کے سلسلہ میں غالب پاشا سے ملنا ضروری تھا اس لیے آپ مکہ مکرمہ سے طائف کے لئے روانہ ہو گئے۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن نے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران لوگوں پر ظاہر کیا کہ یہاں گرمی چونکہ بہت زیادہ ہے نیز آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مزار کی زیارت بھی کرنا چاہتے ہیں اس لیے طائف تشریف لے جا رہے ہیں۔

طائف پہنچنے کے دو تین یوم بعد شیخ الہند' مولانا محمود حسن نے غالب پاشا سے دوبارہ ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بعض اور امور پر بات چیت ہوئی جنہیں آخری شکل دینے کے لئے ایک اور ملاقات طے پائی مگر دوسری ملاقات ہونے سے قبل ہی شریف حسین نے بغاوت کر دی جس کی وجہ سے آپ اور آپ کے بعض رفقاء طائف میں محصور ہو کر رہ گئے۔

انہی دنوں مولانا محمود حسین نے غالب پاشا سے ایک اور ملاقات کی۔ غالب پاشا نے چند باتوں کی بنا پر اپنی مجبوریاں ظاہر کیں اور مشورہ دیا کہ مولانا مکہ معظمہ سے فوری طور پر ہندوستان کے لیے روانہ ہو جائیں اور ہندوستان پہنچ کر رائے عامہ کو مکمل آزادی کے مطالبہ پر متفق کریں۔ مجلس صلح' جو عنقریب ہونے والی ہے' میں انگریز کی پوری کوشش ہوگی کہ ہندوستان آزاد نہ ہو یا کم از کم ہندوستانیوں کو برطانیہ کی نو آبادی کے طور پر بعض مراعات دے دی جائیں مگر ہندوستانی عوام کو چاہیے کہ وہ مکمل آزادی کے سوا کسی شے پر راضی نہ ہوں۔

شیخ الہند کی اسیری

تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد اہل طائف کے ہمراہ مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا کو باہر جانے کی آزادی نصیب ہوئی تب آپ مکہ معظمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغیوں کا کمانڈر تھا۔ اس نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کی مہمانداری کی۔ ایک شب مہمان رکھنے کے بعد اس نے طائف سے مکہ معظمہ تک آپ کی سواری کا بندوبست کیا۔

حج کا زمانہ آچکا تھا اس لیے مولانا محمود حسن نے حج تک مکہ معظمہ میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح آپ حج کرنے کے لئے آنے والے ہندوستانیوں سے اپنے اہل و عیال کی خیریت بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اتفاقاً آخری جہاز سے قاضی مسعود احمد مکہ مکرمہ پہنچے جن کی زبانی مولانا محمود حسن کو حالات سے آگاہی ہوئی۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن فوری طور پر مکہ مکرمہ چھوڑنے کے حق میں تھے کیونکہ آپ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت آپ سے بدظن ہے اور شریف حسین انگریزوں کے آلہ کار ہیں۔

مولانا اگر اکیلے ہوتے تو آپ کی رخصت اتنی مشکل نہ تھی مگر آپ کے چند رفیق بھی سفر میں آپ کے ساتھ تھے جو کسی طرح آپ کی رفاقت ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں ان دنوں مولانا نے قرآن پاک کے ترجمے کا کام شروع کر رکھا تھا جس کی وجہ سے کتابوں کا ذخیرہ بھی آپ کے ساتھ تھا۔ نیز بیماری کے سبب ادویات بھی ساتھ رہتی تھیں۔

ان تمام چیزوں کی نقل و حمل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں جس کے سبب دفعۃً خاموشی سے روانگی ممکن نہ تھی۔ ابھی ان حالات سے نپٹنے کی تدابیر کی جا رہی تھیں۔ اچانک تدبیر کی راہ میں تقدیر حائل ہوگئی اور محرم ۱۳۳۵ء کے آخری ایام میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی جانب سے نقیب علماء مکہ کا ایک وفد عصر کے بعد مولانا محمود حسن سے ملنے پہنچا۔

اس نے شیخ الہند کو بتایا کہ وہ شیخ الاسلام کی ایما پر یہاں آیا ہے اور مولانا محمود حسن سے اس محضر کی تصدیق طلب کرتے ہوئے دستخط کرنے کو کہا۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا "من علما مکه المکرمة المدرسین بالحرم الشریف المکی"[1] (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں)۔ اس میں اس بنا پر ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خان کو معزول کیا ہے' شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا تھا اور ترکوں کی خلافت سے انکار کیا تھا وغیرہ۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا چونکہ یہ محض مکہ مکرمہ کے ان علماء کی جانب سے ہے جو حرم مکہ میں پڑھاتے ہیں اور وہ ہندوستانی ہیں نیز مدرس حرم بھی نہیں ہیں اس لیے ان کا دستخط کرنا ضروری نہیں ہے۔

اس واقعہ کے چند دنوں بعد شریف حسین خود جدہ پہنچا اور اس نے مولانا محمود حسن اور ان کی رفقاء کی فوری گرفتاری کا حکم دیا۔ تب آپ کو مع رفقا کے گرفتار کر کے ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو صبح جدہ پہنچایا گیا۔

ایک ماہ کی حراست کے بعد ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز کے ذریعے آپ لوگوں کو سویز لے جایا گیا۔ اسی شام عصر کے وقت تمام نظر بندوں کو جیزہ کی سیاسی جیل پہنچا دیا گیا۔

اگلے دن بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا انگریز تھا جو نہایت سلیس اور صاف اردو بولتا تھا۔ اس کے پاس ضخیم کتب اور فائلیں تھیں جن میں سی آئی ڈی کے

---

[1] تحریک شیخ الہند' صفحہ ۱۳۶

بیانات اور رپورٹیں درج تھیں۔

مولانا حسین احمد مدنی جو اس اسیری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہمراہ تھے اپنی سوانح حیات میں تحریر فرماتے ہیں' ''ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ گرفتاری تحریک آزادی کے ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو یاغستان' کابل' فرنٹیئر اور دیوبند میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں''۔ ؎

جیزہ کی جیل میں بیانات' دیگر کاروائیوں کی تکمیل پر اسیری کے تقریباً ایک ماہ بعد ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء بمطابق ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو شیخ الہند اور آپ کے رفقا کو مسلح انگریز دستے کی حراست میں جہاز کے ذریعے مالٹا لے جایا گیا۔ آپ ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا پہنچے۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن اور آپ کے حریت پسند رفقا کو تقریباً تین سال دو ماہ کی اسیری کے بعد ۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو مالٹا سے سکندریہ لے جایا گیا۔

مالٹا سے روانگی کے وقت' مالٹا کے ترکی اسیروں بشمول صدر ترکی نے رخصت کیا۔ اس موقع پر شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور پر دعا کی۔ مالٹا سے رخصت کے وقت تمام لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء بمطابق ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو آپ لوگ سکندریہ پہنچے۔ اگلے دن تمام اسیروں کو ''سیدی بشر'' پہنچایا گیا۔ یہاں تقریباً اٹھارہ دنوں کے قیام کے بعد ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو سویز کے لیے روانہ ہوئے۔ سویز میں بھی آپ کو ایک کیمپ میں رکھا گیا۔

اس کیمپ میں پونے دو ماہ کی اسیری کے بعد اتوار ۲۲ مئی ۱۹۲۰ کو جہاز پر عدن کیلئے سوار کرایا گیا۔ سات دن بعد اسیران ہند عدن پہنچے جہاں سے آپ کو ہندوستان پہنچایا جانا تھا۔

نقش حیات صفحہ ۲۳۳

شیخ الہند کی ہندوستان میں واپسی

عدن میں ایک روزہ قیام کے دوران حکیم محمد حسن (دیوبند) ڈاکٹر انصاری (دہلی) اور حکیم اجمیری کو بمبئی شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ہندوستان روانگی کی اطلاع بذریعہ تار دی گئی۔

آپ ۸ جون ۱۹۲۰ء بمطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ ہجری کو ۳ سال ۷ ماہ کی اسیری کے بعد بمبئی پہنچے۔ سمندر میں طوفان کے سبب آپ اگلے دن بندرگاہ پہنچے جہاں ارکان خلافت کمیٹی بشمول مولانا شوکت علی نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔

شیخ الہند' مولانا محمود حسن کو تحریک خلافت کی حمایت سے باز رکھنے کے لئے حکومت نے انتہائی کوشش کی کہ جہاز سے اترنے کے فوری بعد بذریعہ ریل گاڑی دیوبند پہنچا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کی ایما پر مولوی رحیم بخش نے شیخ الہند سے ملاقات کی' مگر شدید بارش کے سبب دوسرے دن جب آپ ساحل سمندر پر پہنچے تو تحریک خلافت کے ہزاروں کارکنوں نے مولانا محمود حسن کو چاروں اطراف سے گھیر لیا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق شیخ الہند کو بذریعہ کار مولانا شوکت علی کی قیام گاہ پر پہنچا دیا گیا۔ بمبئی میں دو روزہ قیام کے دوران بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام ''کھتری مسجد'' میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ جہاں آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

دوسرے دن آپ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے جہاں تنہائی میں سیاست حاضرہ پر کافی دیر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران مہاتما

گاندھی بھی آپ سے ملاقات کرنے مولانا عبدالباری کی قیام گاہ پر پہنچے۔[1]

بمبئی میں دو روزہ قیام کے بعد ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب آپ گاڑی کے ذریعے دہلی روانہ ہوئے اور ۱۳ جون بمطابق ۲۵ رمضان المبارک ۱۹۲۰ء کو صبح دہلی پہنچے۔ آپ نے ایک دن ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو دیو بند پہنچے۔



---

[1] نقش حیات (صفحہ ۲۳۶)

تحریک عدم تشدد اور شیخ الہند کا خطاب

شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن پونے چار سال کی اسیری کے بعد ہندوستان پہنچے تو تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ ہندوستان میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیانوالہ باغ میں ہندوستانیوں کے قتل عام کے واقعات اور مملکت ترکی کی تقسیم، معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی ناانصافیوں نے آپ کے جذبہ حریت اور انگریز دشمنی کو مزید تقویت پہنچائی۔

بمبئی کے ساحل پر مولانا شوکت علی اور ہزاروں فرزندان توحید نے آپ کا استقبال کیا۔ دو روزہ قیام کے دوران بمبئی میں خلافت کمیٹی کے ارکان نے آپ سے ملاقات کی۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی آپ سے ملاقات کے لئے احمد آباد سے تشریف لائے۔ نیز دیگر ہندوستانی رہنماؤں سے بھی آپ کی ملاقات رہی۔

ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں آپ نے بھی عدم تشدد (NON VIOLANCE) کو ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس طریقہ سے شیخ الہند نے خلاف کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کو صاد کیا۔

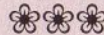
دیو بند میں چند دنوں کے قیام کے بعد آپ حکیم نصرت حسین جو مالٹا میں اسیری

کے دوران آپ کے ہمراہ تھے' کی تعزیت کے لئے کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور پہنچے اور ان کی والدہ' اہلیہ اور بچوں سے تعزیت کی۔

حکیم نصرت حسین' شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہیں مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ کا ساتھی سمجھ کر گرفتار کرلیا گیا تھا۔ انہوں نے انتہائی استقلال کے ساتھ مالٹا میں اسیری کے دن گزارے۔ وہ بیماری کی حالت میں وہیں انتقال کر گئے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن ان کے انتقال سے رنجیدہ خاطر تھے۔ جہان آباد کے سفر کے دوران آپ نے الہ آباد میں قاری عبدالرحمٰن کے مدرسہ میں قیام فرمایا۔ آپ کی آمد پر وہاں ایک ہجوم جمع ہوگیا۔ تب آپ نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو تقریر کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تقریر میں خلافت کمیٹی کی پرزور تائید اور حمایت کی۔

اسی طرح لکھنؤ میں آپ نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ہاں قیام فرمایا اور مولانا شبیر احمد کو تقریر کا حکم فرمایا۔ مولانا محمود حسن کی واپسی' خلافت کمیٹی میں 'شرکت تائید خلافت اور آزادی ہند کی تڑپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کے رہنماؤں نے آپ کے لئے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا۔



شیخ الہند کا فتویٰ

ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ ہندوستانی رائے عامہ انگریزوں کے خلاف تھی اور ترک موالات کا جوش تھا۔ مسلمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی برطانوی سرپرستی سے نجات چاہتے تھے مگر سرکار پرست ٹرسٹیوں کو یہ بات پسند نہ تھی جس کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہم خیال اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد یونیورسٹی سے علیحدہ ہوگئی۔

مولانا محمد علی جوہر اور ان سے متفق لوگوں نے ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تیاریاں شروع کر دیں۔ طلبہ نے شیخ الہند مولانا محمود حسین سے ترک موالات کے متعلق فتویٰ حاصل کر لیا۔ اس فتوے میں انہوں نے مسلم طلبہ پر زور دیا تھا کہ وہ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں۔ تمام سکول اور کالج حکومت کی امداد لینا چھوڑ دیں اور اگر کالجوں اور سکولوں کے اساتذہ گورنمنٹ ایڈ لینا بند نہ کریں تو طلبہ ایسے سکولوں اور کالجوں سے باہر نکل آئیں۔ خلافت کمیٹی کے اراکین نے یہ فتویٰ حاصل کر کے شائع کرا دیا۔

انگریز سرکار نے ایک مرتبہ پھر سر رحیم بخش کو خصوصی طور پر شیخ الہند' مولانا محمود حسن کی خدمت میں روانہ کیا اور فتویٰ واپس لینے کا مشورہ دیا' مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

فتویٰ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ قال

اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے، تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ وتعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان (اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو) ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ (کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے: "اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی اُنہی میں شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

اما بعد! آج جبکہ مشرق و مغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جبکہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز اُڈتے ہوئے طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر (خدانکردہ) پاش پاش ہو جائے، جبکہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی تو ہر وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمع نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمع نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا

تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو، یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔

مالٹا سے واپس آ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بست وکشاد نے آخری طریق کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع اور ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیمہ کی پوری جانچ کر کے، کے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہ ہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے (۳) صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ (۱) اتباع شریعت کیا جائے اور عملدر آمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔ (۲) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فاسد یا نقص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے۔ (۳) ارشاد عثمان اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤ افاجتنب اساء تھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔

والله الموفق المعين

(العبد محمود حسن عفی عنہ دیو بندی ۳ ذی قعد ۱۳۳۸ھ)

یہی فتویٰ متفقہ فتوے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علما کے دستخطوں سے شائع کیا گیا اور اسی فتویٰ اور تحریک کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔



۱ نقش حیات (صفحہ ۲۵۳، ۲۵۴)

شیخ الہند پر بیماری کا حملہ

شیخ الہند' مولانا محمود حسن سفر حجاز سے قبل گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے۔ سردیوں میں مرض بڑھ جاتا تھا' سیڑھیاں چڑھنا' اترنا آپ کے لئے نہایت مشکل ہوتا' نیز بواسیر' کثرت بول وغیرہ امراض کی شکایات بھی رہتی تھیں۔

مالٹا میں نظر بندی کے دوران جہاں شدید قسم کی سردی ہوتی تھی آپ کو ابتدا میں خیموں میں رکھا گیا جہاں باوجود مناسب انتظام کے نیند نہ آتی تھی۔ آپ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے رات اٹھتے' پیشاب کرتے اور ٹھنڈے پانی سے وضو فرماتے۔ مالٹا میں قیام کے دوران یہ شکایات دبی رہیں البتہ ہندوستان واپسی پر دوبارہ لوٹ آئیں۔

شیخ الہند' ان بیماریوں کے سبب کمزور و لاغر ہو چکے تھے مگر آزاد نیشنل یونیورسٹی کے قائدین آپ کو علی گڑھ بلانے پر مصر تھے۔ بالآخر انگریز دشمنی میں علی گڑھ جانا پسند فرمایا اور کہا' ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہو گی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا''۔

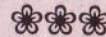
چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بمطابق ۱۶ صفر ۱۳۳۹ ہجری کو جلسہ کی صدارت کی۔ خطبہ صدارت سے متعلق اہم نکات مولانا شبیر احمد عثمانی کو دے کر تحریر کا حکم دیا۔ مسودہ تحریر کرنے پر اسے چھاپنے کا حکم دیا۔ ضعف اور بیماری کے سبب آپ اونچا بول بھی نہیں سکتے تھے اس لیے خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔

جلسہ سے فارغ ہو کر آپ دہلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے انتہائی توجہ سے آپ کا علاج کیا۔ اس دوران جمعیت

العلما اسلام ہند کا دوسرا اجلاس دہلی میں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔[۱]

شیخ الہند سے صدارت کی درخواست کی گئی۔ آپ کی رائے سے ۷۔ ۸ اور ۹ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ آپ نے خطبہ صدارت کی تحریر مولانا کفایت اللہ کے ذمہ کی اور مضمون سے متعلق اہم نکات انہیں لکھوا دیئے۔ مفتی صاحب نے مضمون تحریر کر کے شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا جسے اصلاح کے بعد طباعت کے لئے دے دیا گیا۔

مولانا محمود حسن اس قدر نحیف اور بیمار تھے کہ باوجود دہلی میں موجود ہونے کے جلسہ میں نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔



[۱] نقش حیات (صفحہ ۲۵۶)

شیخ الہند مولانا محمود حسن کی وفات

تمام عمر غیر ملکی سامراج کے خلاف جنگ کرنے والا بطل حریت' شیخ الہند' مولانا محمود حسن بستر علالت پر بھی انگریزوں کے خلاف برسر پیکار رہا۔ مولانا محمود حسن نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بمطابق ۱۶ صفر ۱۳۳۹ ہجری بروز جمعۃ المبارک کو علی گڑھ میں جلسہ کی صدارت کی مگر بیماری کے سبب خطبہ بھی نہ پڑھ سکا۔

اگلے روز علی گڑھ سے دہلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کے زیر علاج رہے۔ ۲۶ نومبر بمطابق ۱۴ ربیع الاول تک آپ کی حالت اطمینان بخش رہی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۲۰ء کو دوبارہ تیز بخار ہوا اور حالت نازک ہو گئی۔ تاہم ہوش و حواس قائم تھے اور آدمی کو پہچانتے تھے بلکہ ضعیف آواز میں بات بھی کر لیتے تھے۔

تیز بخار کی حالت بدستور قائم رہی' ۲۹ نومبر ۱۹۲۰ء کی رات آپ نے اسی حالت میں گزاری۔ سینے پر بلغم جما ہوا تھا جسے کمزوری کے سبب دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صبح شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ چھ بجے اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔

۳۰ نومبر بمطابق ۱۸ ربیع الاول کو آپ کی حالت غیر ہو گئی اور آپ دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہو گیا۔ بستر کے اردگرد حاضرین خاموشی سے ذکر اللہ میں مصروف ہو گئے۔

اسی حالت میں انگریزوں کے ازلی دشمن' انقلابی مسلمانوں اور شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کی چوتھی لڑی کے رہنما نے تین مرتبہ بلند آواز میں اللہ کو یاد کیا اور اسی کے ساتھ

ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کے انتقال کے بعد انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں لڑی جانیوالی جنگ اگرچہ جاری رہی مگر اس جنگ کا وہ باب جو آئینی جدوجہد کے برعکس عسکری تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔



شیخ الہند کا سفر آخرت

شیخ الہند محمود حسن کی وفات کی خبر لمحوں میں جنگل کی آگ کی طرح دہلی میں پھیل گئی۔ وفات کی خبر سنتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی اپنی دکانیں فوراً بند کر دیں۔ پھر ہزاروں مسلمان ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کا تقاضہ کرنے لگے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لیے چھوٹے بھائی حکیم محمد حسن نے اس موقع پر لوگوں سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کا اصرار ہے تو آپ نماز جنازہ پڑھ لیں۔ میں یہاں نماز میں شریک نہ ہوں گا تاکہ میں دیوبند میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھائی صاحب کی نماز جنازہ ادا کر سکوں۔

لوگوں کی خواہش پر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کے سامنے خالی میدان میں شیخ الہند کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ دہلی کے مسلمانوں کی کثیر تعداد نے نماز جنازہ ادا کی۔ بعد ازاں ان کا تابوت آہستہ آہستہ ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ سٹیشن پہنچنے تک سوگواروں کی تعداد ۲۰ ہزار کے قریب ہو گئی۔

ریلوے سٹیشن پر شیخ الہند کی نماز جنازہ دوبارہ پڑھائی گئی۔ ڈھائی بجے کے قریب گاڑی سٹیشن سے روانہ ہوئی۔ میرٹھ شہر اور میرٹھ چھاونی میں بھی ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس طرح تابوت رات ساڑھے سات بجے دیوبند پہنچا۔[1]

دیوبند میں خدا جانے کہاں کہاں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن کے عقیدت مند اور سوگوار آ کر جمع ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کا جنازہ سٹیشن سے نکلا اور بہت دیر

[1] بیس بڑے مسلمان بحوالہ سوانح شیخ الہند صفحہ ۱۵۲

کے بعد مکان پر پہنچا۔ قبر چونکہ پہلے سے تیار تھی' اس لیے بہت سے لوگوں کی رائے تھی کہ انہیں رات کے وقت ہی سپرد خاک کر دیا جائے۔

مولانا محمود حسن کی وفات کی اطلاع ملتے ہی ان کی صاحبزادیاں اور داماد دیوبند سے دہلی کیلئے روانہ ہو گئے تھے۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھے کہ جنازہ غازی آباد پہنچ گیا۔ اس لیے وہ غازی آباد کے سٹیشن پر اتر گئیں۔ سٹیشن پر سوگواروں کا بے حد ہجوم تھا نیز گاڑی بھی سٹیشن سے جلدی روانہ کر دی گئی۔ اس لیے وہ جنازے کے ہمراہ نہ جا سکیں۔

ان کے جنازہ کے ساتھ روانہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے یہ طے پایا کہ جنازے کو اگلی صبح دفن کیا جائے اور صاحبزادیوں کا انتظار کر لیا جائے۔ اس لیے وہ دوسری گاڑی سے رات کے وقت دیوبند پہنچیں۔

شیخ الہند کا جسد خاکی دیوبند پہنچا تو سہارن پور' مظفر نگر اور ارد گرد کے علاقوں سے بے پناہ لوگ ان کی زیارت کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچایا گیا تو نو درہ اور باہر کا صحن سوگواروں اور عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔

لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے صف بندی ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ولی' اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن نے نماز جنازہ پڑھائی۔ سارے مجمع پر ایک پر کیف سکوت طاری تھا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کی نماز جنازے میں لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جنازے کا اتنا بڑا مجمع کبھی اس سے پہلے دیوبند میں دیکھا نہیں گیا تھا۔ مدرسہ کے دروازے سے قبرستان تک انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

جنازہ مقبرے میں پہنچا۔ ۴۲ سال کی ظاہری جدائی کے بعد یہ شاگرد رشید فخر استاد اپنے مرشد و استاد کی خدمت میں پہنچ گیا۔ قبر تیار تھی' جنازہ لا کر دکھایا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن اور مولانا محمود حسن کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے۔

چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے امام المحد ثین' بطل حریت اور گنجینہ حکمت الٰہیہ کو لحد میں اتارا گیا اور یوں شریعت و طریقت کے آفتاب عالم تاب کو سپرد خاک کر دیا گیا۔[۲]

۲۔ ایضاً

قومی اخبارات و رسائل کی رائے

کتاب	:	سیدہ خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا
ضخامت	:	۶۴ صفحات عمدہ کتابت طباعت
قیمت	:	۴۰ روپے
ناشر	:	ادارہ ادب اطفال رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

روزنامہ نوائے وقت:

تبصرہ نگار: انور سدید

سیدہ خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا

ظہور الدین بٹ نے قلم و قرطاس کے ساتھ رشتہ استوار کیا تو انہوں نے رزق حیات حاصل کرنے کے لیے صحافت کو اسلامی قدروں کے مطابق اپنا پیشہ بنایا لیکن عشق ادب سے کیا اور معاشرے کو صراط مستقیم پر چلانے کے لیے ایسے کرداروں کی کہانیاں لکھیں جن کے ایثار و قربانی کی مثالیں وطن عزیز کے بچوں' جوانوں اور بوڑھوں کے سامنے پیش کرنا ضروری تھیں۔ ان کی کتابیں پاکستان' افغانستان اور بالخصوص کشمیر کے مجاہدین کے مجاہدانہ کارناموں پر مبنی ہیں۔ لیکن اب وہ تاریخ اسلام کی طرف آ گئے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے حضور نبی اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی زوجہ محترمہ ''سیدہ خدیجہ طاہرہ'' پر زیر نظر کتاب پیش کی ہے اور مقصد یہ ہے کہ ان کے تذکرہ جمیل سے قربانی' اطاعت' ایثار اور عمل کی وہ شمع روشن کی جائے جس کی کرنیں صدیوں سے صحرائے عرب سے ہم تک پہنچ رہی ہیں لیکن آج کے زمانے کے مرد اور عورتیں ان سے استفادہ کرنے سے محروم ہیں۔ حضرت خدیجہ کبریٰ نے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی اور اپنے بیٹے حارث کو رسول اللہ ﷺ پر قربان کر دیا پھر مکہ میں آزمائش کے کڑے دور میں' کفار اور مشرکین کی صعوبتوں میں ان کا ساتھ دیا۔ وہ عفت و عصمت' صبر و تحمل اور قربانی و ایثار کی صاحب کردار مثالی خاتون تھیں۔ انہوں نے وفات پائی تو نبی اکرم ﷺ نے قبر میں اتر کر ان کے جسد اطہر کو لحد کے سپرد کیا۔ اس مثالی خاتون کے حالات زندگی ظہور الدین بٹ نے دینی جذبے سے اس کتاب میں اجمال سے پیش کئے ہیں۔ زیر نظر کتاب کی ضخامت ۶۴ صفحات ہے اور قیمت ۴۰ روپے۔ یہ کتاب بظاہر بچوں کے لیے مکمل گئی

ہے لیکن بڑی عمر کی خواتین اور مرد بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ ادب اطفال۔ رحمان مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور۔

روزنامہ پاکستان:

تبصرہ نگار: نذیر حق

ظہور الدین بٹ' حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات' جوامت کی مائیں ہیں' پر کتب کا سلسلہ لکھ رہے ہیں ان کا انداز بیان سادہ' دلچسپ اور معلومات سے بھر پور ہے۔ اس مختصر تالیف کے ذریعے ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی اور حضور نبی کریم ﷺ سے رفاقت کا حال اور اسلام کے لیے ام المومنین کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے' جسے پڑھ کر ایمان تازہ اور حب رسول کریم ﷺ میں اضافہ ہوتا ہے۔ خواتین اور خصوصاً بچیوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ کتاب عمدگی سے طبع اور پیش کی گئی ہے اور قیمت بس برائے نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ظہور الدین بٹ صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں اور سبھی امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے بارے میں مختصر کتب تحریر کریں۔

ماہنامہ بیدار:

تبصرہ نگار: طالب الہاشمی

اسلام کی خاتون اول ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو ہماری تاریخ میں جو عظیم مقام و مرتبہ حاصل ہے' وہ محتاج بیان نہیں۔ انہوں نے سخت نامساعد حالات میں جس طرح نبی اکرم ﷺ کا ساتھ دیا اور اپنا سب کچھ آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا' اس کو حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ یہ ان کی غمخواری اور جاں نثاری ہی تھی کہ جب تک وہ حیات رہیں' نہ کسی دشمن کو آپ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت ہوئی اور نہ کسی دوسری خاتون کو آپ کے حرم اقدس میں داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ کتاب اسی عظیم المرتبت ہستی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ اسے معروف ادیب جناب ظہور الدین بٹ نے ایسے سادہ اور دلکش انداز میں قلمبند کیا ہے کہ ام المومنین کی سیرت و کردار کے نورانی نقوش مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف نونہالان قوم بلکہ بڑی عمر کے خواتین و ذکور بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔ اگر تمام اسماء پر اعراب لگا دیے جاتے تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

